

188672

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188672

UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—881—5-8-74—15,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

U.
Call No.

922.978

U
Accession No.

14824

Author

MA

Title

شیخ محمد ادریس
"شہد نامہ"

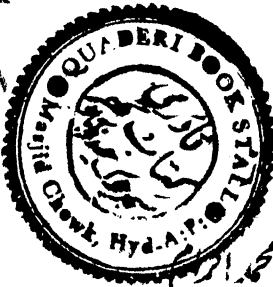
This book should be returned on or before the date last marked below.

شہلی نامہ

ایک فن کار کی داستانِ حیات

No. 492240

مکتبہ اسلامیہ دارالافتاء دارالحدیث دارالعلوم
دارالکتاب دارالمدینہ دارالمنار دارالمنیر دارالمنیر
دارالمنیر دارالمنیر دارالمنیر دارالمنیر دارالمنیر



شیخ محمد ابراہیم

ہم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ سی۔ اے۔ یس (آئی۔ سی۔ ایس)



جدید سیرت نگاری

سیرت نگاری کی نسبت علامہ شبلی مرحوم کا نقطہ نظر عام مشرقی تذکرہ نویسوں کے زاویہ نگاہ سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی رائے تھی کہ سیرت نگار کو صاحب سیرت کی زندگی کا ہر پہلو دکھانا چاہیے۔ سیاہ بھی اور سفید بھی۔ روشن بھی اور تاریک بھی۔ وہ ان لوگوں کے مخالف تھے جو کسی کے "معائب" دکھانے کو تنگ خیالی اور "لبنتی" سمجھتے ہیں اور کہتے تھے کہ اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور لمبی تر قیاں سب برباد ہو جائیں۔

شبلی تذکرہ نویس کے متعلق اپنے نظریے کو فقط عام دنیا داروں تک محدود نہ رکھتے تھے۔ بلکہ ان کا تو خیال تھا کہ صحابہ کرام کی زندگیاں بیان کرتے وقت بھی اس اصول پر عمل کیا جائے۔ وہ نواب مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کو جو صحابہ کے حالات میں ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

صحابہ کے حالات سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی لیکن ہر پہلو کو لیجئے۔ اور ان پہلوؤں کو صاف دکھلائیے۔ جن سے آج کل کے مولوی تھہر جستم پوشی کرتے ہیں۔

شبلی پچارے کو کیا معلوم تھا کہ جس قسم کی سوانح نگاری کے وہ خلاف تھے اس کا سب سے بڑا دارالاشاعت ان کا پناہ دار المصنفین ہو گا۔ اور اس کا سب سے

نمایاں نمونہ ان کی اپنی سوانح عمری، حیات شبلی میں ملے گا۔
 تذکرہ نویس کے متعلق شبلی کا نقطہ نظر بڑی حد تک انگریزی ادیب
 کارلائل سے ماخوذ تھا جو یہ کہتا تھا کہ ایسی سوانح عمریاں لکھنے سے
 حقیقت کو آئینہ نہیں دکھاتیں، بہتر ہے کہ سوانح عمریاں سرے سے لکھی
 جائیں۔ لیکن کارلائل کے بعد مغرب میں دو نئے اثرات کار فرما ہوئے ہیں
 جنہوں نے سوانح نگاری کے پرانے تخیل کو یکسر بدل دیا ہے۔ ان
 اثرات میں سے ایک تو جدید علم نفسیات کی نشوونما ہے جس کی وجہ سے
 انسانی ذہن کی زیرنگیوں اور افراد کی باطنی کشمکش میں ارباب علم کی درجہ
 بہت بڑھ گئی ہے۔ بایوگرافی اب فقط سوانح نویسی نہیں رہی بلکہ سیرت
 ہو گئی ہے۔ اور تذکرہ نویس کا کام فقط صاحب تذکرہ کے ظاہری کارنامے
 گنانا نہیں بلکہ اس کی شخصیت کو بے نقاب کرنا اور اس کی نفسیاتی سر
 کی ایک روشن اور واضح تصویر کھینچنا ہے۔

بایوگرافی میں اس انقلاب کا دوسرا سبب انگریزی سیرت نگار لٹن اسٹریٹ
 کی مثال اور تحریریں ہیں۔ اس نے ان بھاری بھرکم ”مفصل اور مستند“
 سوانح عمریوں کے خلاف آواز اٹھائی جن میں بغیر کسی انتخاب اور کسی درجہ
 تخیل (پلین) کے، صاحب تذکرہ کے متعلق واقعات کا ایک ایسا انبار
 کر دیا جاتا ہے جس سے نہ تو پڑھنے والے کو دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور
 ہی صاحب تذکرہ کی شخصیت کے خط و خال نمایاں ہوتے ہیں لیکن اسٹریٹ
 نے سیرت نگاری کو ایک ہلکی پھلکی چیز بنا دیا ہے جس میں افسانے
 دلچسپی اور عالم نفسیات کی زبردستی آگئی ہے۔ تذکرہ نگار اب بھی صاحب
 کی نسبت واقعات و معلومات کا ذخیرہ جمع کرتا ہے بلکہ طلب کا دامن

سے بھی زیادہ دور پھیلاتا ہے۔ لیکن تمام واقعات کا احاطہ کرنے کے بعد وہ دریا کو کونے میں نہیں، ایک ایسے جامِ بتواریں میں پیش کرتا ہے جس کے اندر سے صاحبِ تذکرہ کی شخصیت صاف جھلکتی ہے۔

۱ جیسا کہ حالی نے اردو کی پہلی سوانحِ عمری حیاتِ سعدی کے شروع میں لکھا ہے۔ اردو میں جدید سوانح نگاری، انگریزی ادب کے راستے سے آئی لیکن ہمارا اطریشجہر انگریزی سوانح نگاری کے تازہ ترین اثرات سے بالکل محروم رہا ہے۔ ہمارے تذکروں میں حالی کی حیاتِ جاوید کو ”برتر سے برتر سوانحِ عمری“ کہا جاتا ہے۔ لیکن حیاتِ جاوید کی بڑی ٹھوس خوبیوں کے باوجود ہمارے خیال میں، یہ کہنا مشکل ہے کہ حالی نے سرسید کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی کتاب سرسید کے کارناموں کی تفصیل اور ان کے ایک مفصل مگر سطحی تجزیے پر مشتمل ہے۔ مفصل۔ مدلل۔ متوازن۔ منصفانہ۔ لیکن یادِ کارِ غالب کی طرح

ایک فنی شاہکار نہیں۔ اس سے سرسید کے متعلق تمام واقعات جاننے کے بعد بھی ان کی ایک روشن اور واضح تصویر پڑھنے والے کے دل پر نقش نہیں ہوتی! حیاتِ جاوید کے بعد شاید حیاتِ شبلی ہماری زبان کی سب سے مفصل اور وسیع سوانحِ عمری ہے۔ اور حیدر آباد کے ایک پروفیسر صاحب نے تو کہہ دیا ہے کہ سید سلیمان نے حیاتِ شبلی لکھ کر حالی سے وہ نازِ فضیلت چھین لیا جو حیاتِ جاوید کی بدولت اس کے سر پر تھا۔ افسوس ہے کہ حیاتِ شبلی پر تفصیلی تبصرہ کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس میں متعدد ٹھوس خوبیاں ہیں اور ایک دھڑکندہ شہید کو اب بھی۔ ان سب کے گنانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔

خیمِ زلف و رختِ اشرفِ دادن
شکے باید دراز و ماہِ مہتابے

لیکن یہ تو شاید سید سلیمان بھوپر نہ کہیں گے کہ انھوں نے ان ترقیوں سے
 جنھوں نے گذشتہ چالیس سال میں علم نفسیات کا نقشہ بدل دیا ہے۔ یا ان
 تبدیلیوں سے جو حیاتِ جاوید کی تصنیف کے بعد سیرت نگاری کے فن میں رونما
 ہوئی ہیں۔ کسی طرح بہرہ ور ہونے کی کوشش کی ہے

نہ صرف ہمارے ادبِ علم و ادب نے دوسرے ملکوں کی فنی اور علمی ترقیوں
 سے آنکھیں بند کر لی ہیں بلکہ ملک میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے جو صحیح سیرت نگاری
 کے لئے باوجود سموم کا اثر رکھتا ہے۔ یعنی جس رفتار سے ہمارے اکابر اور
 راہنماؤں کی اخلاقی حالت تنزل کر رہی ہے۔ بالکل اسی تناسب کے قوم میں یہ
 جذبہ بڑھ رہا ہے کہ انہیں ہر طرح سے بے حیثی قلم بنا کر پیش کیا جائے۔

ہر سبب از سرمایہ کا ست، دمِ ہوس افزہ ایم
 اس مقصد کے لئے نہ صرف سوانح نگار سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ صاحبِ
 سیرت کی زندگی کی بعض بنیادی باتیں نظر انداز کر دے۔ بلکہ اب تو یہ کوشش
 ہو رہی ہے کہ سوانح نگار کو صحیح تصویر کھینچنے کے لئے جو رنگ و روغن مدد کار
 ہے۔ اس سے ہی محروم ہی کر دیا جائے اور صاحبِ تذکرہ کی زندگی کے متعلق
 جو مواد موجود ہے۔ اس میں سے وہ عناصر نکال لئے جائیں جو عقیدت
 مندوں کو پسند نہیں!

سوانح نگاری کے متعلق قوم کے نقطہ نظر میں جو تبدیلی ہو گئی ہے۔ اس کا
 اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ
 العزیز کے تذکرہ نگار توان کی نسبت لکھ دیتے ہیں کہ وہ حصولِ زمین کی
 خاطر سلطان شمس الدین القتمش سے ملنے اجمیر سے دہلی آئے اور حضرت
 خواجہ کی شان میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اقبالؒ کا کوئی ایسا خط ملاحظہ

ہو جاتا ہے۔ جس میں حیدر آباد ہائی کورٹ کی ججی کے متعلق ایک خفیہ سا اشارہ ہے۔ تو ان کے مداح بے قرار ہو جاتے ہیں!

شاید یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک قومی راہنما انسان نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کی جائز تکمیل کا سامان کرے۔ یا اس کے خاندان اور اس کی اولاد کا اس پر کوئی حق نہیں!!

اور انہیں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اگر ان کے ہیرو کی زندگی میں بھئی سی چیزیں ہیں۔ جو نظر کو کھٹکتی ہیں۔ نو کیا یہ اس کا فرض نہیں کہ وہ اپنی علمی زندگی کی اصلاح کرے اور کیا یہ قومی ہی خواہی کاراستہ ہے کہ حقیقت و ختم پوشی کر کے تذکرہ نگار ریاکاری کے فروغ کا اور سامان کرے؟

آج سچی سیرت نگاری کے لئے ملک کی فضا ناسازگار ہے۔ قومی خیالات کی باگ ان لوگوں کے جانشینوں اور ہوا خواہوں کے ہاتھ میں ہے جو تمام عمر مذہب۔ مذہب پکارتے رہے۔ (اور فی الواقع انہیں مذہب سے شدید جذباتی محبت تھی) لیکن مذہب کی اصل روحانی خوبیوں، یعنی باطنی پاکیزگی۔ تقوٰے اور اخلاقی ڈسپلن سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملا۔ ان لوگوں کے مداح اب اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے مددحوں کی زندگیاں قریب دیکھی جائیں اور ان کا نقشہ واقعات کے مطابق کھینچا جائے۔ ایک تذکرہ نویس کے لئے ایسی حالت میں حقیقت نگاری کی وادی میں قدم رکھنا اور اردو میں جدید سیرت نگاری کا نمونہ پیش کرنا اختلاں اور مخالفت کو دعوت دینا ہے۔ ایک سعی نامشکور کو ہاتھ میں لینا ہے۔ لیکن کیا اہل قلم پر سچائی۔ اصول فن۔ اور قومی ہی خواہی کی طرف سے کوئی فرض عائد نہیں ہوتا؟؟؟

اور شبلی کی زندگی کے ہر گوشے پر روشنی ڈالتے ہوئے اور حقیقت نگاری کو

مطرح نظر بناتے ہوئے، ہمیں اس خیال سے بھی تقویت ہوتی ہے کہ یہ وہی طریق کار ہے۔ جس کی شبلی تلقین کرتا تھا۔

ہمیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ اس عمل سے شبلی کی اصل عظمت اور سر بلندی میں (جو علمی۔ ادبی اور فنی ہے)۔ (اور مذہبی۔ اخلاقی یا روحانی نہیں) کوئی فرق نہیں آئے گا۔

اکرام

استدراک سید سلیمان نے جس انداز سے شبلی کی سوانح عمری لکھی ہے۔ اس میں ہمارے طریق کار میں بعد المشرقین ہے۔ لیکن ناسپاسی ہوگی۔ اگر ہم یہاں ان سہولتوں اور آسانیوں کا اعتراف نہ کریں۔ جو حیاتِ شبلی کی بدولت ہمیں میسر آئیں۔ ہم نے شبلی کے متعلق قریب قریب سارا قابل حصول تحریری مواد خود دیکھا ہے اور دستِ طلب دور دور تک پھیلایا ہے۔ لیکن سید سلیمان کی کتاب میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن تک ہماری رسائی نہ تھی اور پھر ان کی کتاب میں شبلی کے واقعاتِ زندگی کو تاریخی تسلسل و تفصیل سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس نے ہمیں بہت سی رحمتِ غیر ضروری سے بچالیا۔

سید سلیمان ندوی کی نسبت ہم مودع کوثر میں خوب ہر اگل چکے ہیں۔ (گو اگر بزرگانِ اعظم گڑھ ہماری جسارت نظر انداز کر کے، ہماری شکایات کو بغیر انصاف کی گھلیں تو شاید انہیں ان میں اپنے ادارے کے بعض بڑھتے ہوئے امراض کا مداوا بھی نظر آجائے!) موجودہ کتاب میں بھی ایک بحث میں، جہاں ہمارے خیال میں سید سلیمان نے میزانِ عدل کا پتہ چھکایا ہی نہیں، بالکل بٹھا دیا تھا۔ ہم نے اپنے خیالات بلا کم و کاست بیان کر دیے

ہیں اور کوئی بات لگی لپٹی نہیں رکھی۔ یقین ہے کہ ہمیں سید سلیمان کے خاص عقیدت مندوں میں سے نہ گنا جائیگا۔ لیکن ہمیں سخت افسوس ہوگا۔ اگر ان چند شکایات و اختلافات کی بنا پر یہ خیال کیا جائے کہ ہمارے دل میں سید سلیمان کی دوسری بے اندازہ اور کھٹوس، علمی، اخلاقی، اور روحانی خوبیوں کی قدر نہیں۔

سید سلیمان نے جس طرح حیاتِ شبلی میں شبلی کی زندگی کا ایک پہلو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس سے ہمیں اختلافات سہی۔ شبلی اور سید کے متعلق انھوں نے جس انداز سے بحث کی ہے۔ اس سے ہمارے خیال میں شبلی کو بجائے فائدے کے نقصان ہوگا لیکن آخر الاعمال بالنیات۔ سید سلیمان نے ان دونوں باتوں میں جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ اس کا سبب ایک نیک اور سعادت مند شاگرد کی فرطِ عقیدت کے سوا کچھ نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ سوانح نگار کے لئے فرطِ عقیدت طرہٴ دستار نہیں بلکہ زنجیر یا ہوتی ہے تو ہم کہیں گے کہ جو عقیدت مندی کسی سے حیاتِ شبلی جیسی سیرِ حاصل اور فاضلا کتاب لکھوالے۔ اسے کس طرح ایک عیب سمجھا جاسکتا ہے؟ آپ مولف کی ایک آدھ بات سے اختلاف کر لیں لیکن اس میں جو ذخیرہٴ معلومات جمع ہے۔ اس کی قدر نہ کرنا بے انصافی ہے۔ اگر آپ اسے کمال سوانحِ عمری نہ سمجھیں (اور کڑے نقطہٴ نظر سے آخر ہماری زبان میں کتنی کامل سوانحِ عمریاں ہیں؟) تب بھی حیاتِ شبلی میں فاضل مولف نے ہماری بیس چالیس سال کی مکمل علمی، ادبی اور مذہبی تاریخ جس طرح پیش کی ہے اور (یادش بخیر) دوبارہ یورپ کی کوئی سات سو سال کی علمی تاریخ لکھ دی ہے۔ اس کا احسان سے کس طرح انکار ہو سکتا ہے؟

سید سلیمان کے علاوہ جناب عطیہ بیگم صاحبہ فیضی کا شکریہ ادا کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ جنہوں نے بحال فیاضی ہمیں شبلی کے اصل خطوط اور ان کی دوسری قلمی تحریریں دیکھنے کو دیں۔ شبلی کی دو بُرائی اور غیر متعارف تصاویر بھی ہمیں ملیاں اور اپنی بیش قیمت خاندانی ڈائری سے شبلی کے متعلق اندراجات اور ان کے بعض غیر مطبوعہ اشعار نقل کرنے کا موقع دیا۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب صوفی مصنف المنہاج (انگریزی) بھی ہمارے دلی شکر کے مستحق ہیں۔ ان ہی کی بدولت عطیہ بیگم صاحبہ تک ہماری رسائی ہوئی اور انہوں نے دو روز ہمارے ساتھ شریک رہ کر شبلی اور بعض دوسرے اکابر (مثلاً اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد) کے متعلق جو چیزیں ہم نقل کرنا چاہتے تھے۔ انہیں نقل کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ ڈاکٹر صاحب، شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے پرانے جاننے والوں میں سے ہیں اور ان کی گفتگو ان دو بزرگوں کے متعلق ان واقعات کا بیش بہا خزانہ ہوتی ہے۔ جن سے نئی نسل بہت حد تک نا آشنا ہے۔

آخر میں ایک فوسنک فرض، جناب عبدالرزاق انعام مرحوم کا اعتراف احسان ہے جن سے ہمیں اندوہ کے پرانے فائل اور بعض دوسری کتابیں مستعار ملیں۔ اور جو اس کتاب کے ایام تالیف میں وفات پا گئے۔ مرحوم ایک بڑے اخلاص شعار سادہ منش اور صاحبِ وقوف مسلمان تھے۔ اردو سے انہیں محبت ہی نہیں معشوق تھا۔ اور انہوں نے صوبہ بمبئی کے ایک وردرا گوشے (بلغام) میں مطبوعہ اردو کتب و رسائل کا ایک سیاسی بیش بہا ذخیرہ جمع کر لیا تھا جس کے ہم پایہ ذاتی کتب خانے شمالی ہندوستان میں بھی خال خال ہیں۔ خدا مرحوم کو جو ارحمت میں جگہ عطا کرے اور ان کے ورثہ کو توفیق دے کہ وہ مرحوم کے نیک کام جاری رکھ سکیں۔

حالی اور آزاد، محسن الملک اور وقار الملک کتنے آسمانوں کے
تارے تھے؟ ایک بادویاتین کے۔ ان میں شبلی کی بوقلمونی کہاں آئیگی؟
جو رندوں میں رہتے تھے۔ زہاد میں زہاد۔ شاعروں میں شاعر۔ شعرا میں
شاعر۔ معلموں میں معلم۔ مورخوں میں مورخ۔ سیاستدانوں میں سیاس
اردو میں عشقیہ خطوط کے بانی۔ تعلیم میں نئی روش کے آموزگار اور
علمی تصنیف و تالیف کے میدان میں ہماری زبان کے سب سے
بائے شہسوار!

قلیل مدتِ حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ
کر دکھایا کیا وہ ایک معجزہ سے کم ہے؟
دیرم۔ شاعر۔ رند۔ نیم شیوہ ہادرم
گرفتہ رحم برفریاد و افغانم نئے آید! (موج کوثر)

شہابی نامہ

خاندان - طفولیت - تعلیم

شمس العلماء علامہ شہابی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ راجپوت نسل سے تھے اور ان میں
س قوم کی ساری خودداری، زود حسی، اولوالعزمی، قبیلہ پروری اور جنگجوی
موجود تھی۔

لیکن وہ خالص راجپوت نہ تھے۔ ان میں بہت سا باہر کا خون ملا ہوا تھا۔
ان کا خاندانی لقب عام مسلمان راجپوتوں کی طرح کنور یا رانا یا چودھری یا
خان نہ تھا۔ شیخ تھا اور ان میں وہ شہرت، علم و فضل اور مصلحت دہی کے
تحت اپنے صحیح خیالات و جذبات کو چھپا رکھنے کی عادت، جو راجپوتوں کے خاص
ادب و صفت میں سے نہیں۔ صاف نمایاں ہے۔

ان کے سب سے پہلے بزرگ، جن تک سلسلہ تحقیق و نقیبش کی کڑیاں
پہنچتی ہیں۔ شیوراج سنگھ جی تھے۔ ان کے مسلمان ہونے کا ایک عجیب و غریب

قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ جو نہ صرف غایت درجہ دلچسپ ہے بلکہ شبلی کے لکھوٹی طبعی رجحانات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ علامہ کے ایک عقیدت مند شاگرد، مولوی اقبال احمد سہیل اپنی ناتمام سیرت شبلی میں لکھتے ہیں:-

”ایک دن (شیوراج سنگھ جی کو) شدید گرمی کے موسم میں صبح کو نہار منہ علاقہ زمینداری پر کسی ضرورت سے جانا پڑا۔ اتفاقاً دیر ہو گئی۔ دوپہر کو کئی میل کی مسافت دھوپ میں طے کر کے مکان پر پہنچے۔ بھوک پیاس سے بقیاب ہو رہے تھے۔ گھوڑے سے اترتے ہی سیدھے چوکے میں چلے گئے۔ یہ خیال نہیں رہا کہ جوتیاں باہر اُتار دیں۔ اُن کی بڑی بھاونچہ جو چوکے میں کھانے کا انتظار کر رہی تھیں اور جیسا کہ ہندو مستورات کا دستور ہے۔ اب تک بے آب و دانہ تھیں۔ بگڑ کر بولیں۔ ”کیا نرے ترک ہی ہو گئے۔ جوتے پہنے چوکے میں چلے آئے اور سارا کھانا بھڑٹ کر ڈالا!“

یہ بھی گھبرے آخر راجپوت، ان کو بات کی برداشت کہاں!! وہ بھی ایسا شدید طعنہ اور عورت کے منہ سے!!
شیوراج سنگھ نے بھاونچہ کا فقرہ سنتے ہی کہا کہ ہم کو ترک ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے تو بیچ میچ ترک ہوئے جاتے ہیں!.....

اسی وقت گھر سے نکلے اور موضع خاٹقاہ کی مسجد میں جا کر نہ صرف اپنی تشکی بھائی بلکہ دین حق کے آبِ حیات سے بھی سیراب ہوئے اور ریح الدین اسلامی نام قرار پایا۔“

خدا کی شان ہے۔ جب کسی کو راہِ ہدایت دکھانا ہو تو ایک عورت کا طعنہ

ہی نوا۔ اے سروش بن جاتا ہے اور وہ کام کر لیتا ہے جو سینکڑوں علماء کے
وعظ و تبلیغ سے ممکن نہیں!

اور ٹھا کر شیوراج سنگھ جی کی طبیعت کی تیزی اور زود حسی بھی بھولنے
کی چیز نہیں۔ کیونکہ ان کی اولاد کو بھی اس میں سے پورا پورا حصہ ملا تھا اور
شبلی کی شخصیت میں کوئی چیز اس قدر نمایاں نہیں جتنی یہ شدید ذکاوت جس ||
شبلی نے ایک متمول گھر میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ
شہر اعظم گڑھ کے رئیس اعظم تھے۔ وہ بہ یک وقت ایک کامیاب وکیل۔ ایک
خوش حال زمیندار اور ایک اوالعزم تاجر تھے۔ اس زمانے میں شہر کی
میونسپل کمیٹی کا صدر حاکم ضلع ہوتا تھا۔ معززین شہر کی زیادہ سے زیادہ
رسائی اس بات تک تھی کہ وہ آنریری سکریٹری ہو جائیں اور جب تک شیخ
حبیب اللہ کی صحت نے اجازت دی۔ وہ اس عہدہ پر مامور رہے۔ وہ ضلع
کے چوٹی کے وکیلوں میں سے سمجھے جاتے تھے اور ان کی زمینداری بھی وسیع تھی۔
اس کے علاوہ انھوں نے دیسی شکر کے کارخانے اور ریل سازی کی کوٹھیاں
قائم کر رکھی تھیں۔ جن سے خاطر خواہ فائدہ ہوتا تھا۔ وہ سرکار کو چھ ہزار روپیہ
سالانہ بطور مالگداری ادا کرتے تھے اور ان کی کل سالانہ آمدنی کا اندازہ تیس
(یعنی قریب قریب ایک کشر کی تنخواہ تک) کیا جاتا ہے۔

مولانا شبلی جو ۱۸۷۷ء میں اعظم گڑھ کے نواحی گاؤں بندول میں پیدا
ہوئے۔ شیخ حبیب اللہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ایک اسی گھرانے میں
بڑے بیٹے کی جو عزت و خاطر ہوتی ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں اور شیخ
حبیب اللہ تو اپنی اولاد کی خوشی میں گھر لٹا دینے والے باپ تھے۔ ان کے
دوسرے بیٹے ہمدی حسن ولایت سے تعلیم پا کر آئے تو شفیق والد نے جس

دھوم دھام سے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ آج تک اعظم گڑھ والوں کو بھولا نہیں۔

سات روز تک مسلسل اہل شہر کی دعوت رہی اور فیاضی اور امارت کا دل کھول کر مظاہرہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ شبلی کی اس گھر میں کتنی قدر و منزلت ہوگی۔ چنانچہ سید سلیمان لکھنے ہیں۔ ”مولانا مرحوم کا بچپن بہت ناز و نعم میں گزرا“ اور جو دو ایک واقعات ان کے بچپن کے ملتے ہیں۔ ان سے شبلی کے ماحول کی آسائش اور اُن کی اپنی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن اس بچے کے لئے اپنے ماحول میں فقط آرام و آسائش نہ تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو اس سے ایک طرح کی ضد تھی۔ اس کے لئے پھولوں کی جو سیج تیار ہوتی۔ اس میں کانٹوں کی بھی ایک صف ساتھ بچھ جاتی۔ یا پھول ہی کانٹوں میں تبدیل ہو جاتے۔ انگریزی ادب لاطفا میں ایک نو مولود کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ جس کی پیدائش پر دور دور سے پرہیز آئیں اور طرح طرح کی نعمتیں ساتھ لائیں۔ لیکن ایک خشک کن بری ایسی بھی آئی جس نے ان نعمتوں کو مصیبتوں میں بدل دیا۔

شبلی کے ساتھ بھی قدرت نے تمام عمر اسی طرح کی ستم ظریفی کی اور اس کا آغاز ان کے اپنے گھر سے ہوا۔ شبلی کا گھر ایک عیش و آرام کا گہوارہ تھا۔ خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ شفیق باپ اور عزیز ماں کا سایہ ان کے سر پر تھا۔ لیکن جلد ہی اس فردوسِ مسترت میں بادِ صرصر کے جھونکے آنے شروع ہوئے۔ شبلی کے والد نے ایک اور شادی کر لی اور اس گھر کا شیرازہ محبت بالکل درہم برہم ہو گیا!

شبلی اور شبلی کی والدہ پر اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ ان کی والدہ نے اس کے بعد تمام عمر روتے گزاردی۔ ”شیخ صاحب نے غیر کفو میں جو

شادی کر لی تھی۔ اس سے وہ بہت دلگیر رہا کرتی تھیں اور آخر اسی غم میں وفات پائی۔ ”شبلی کو اپنی والدہ سے سید محبت تھی اور باپ کا فعل سخت ناگوار تھا۔ والد کی ساری زندگی میں انھوں نے سوتیلی ماں سے بات نہیں کی۔ اس کے گھر نہیں گئے اور جب باپ کی وفات کے بعد وہ اپنی سوتیلی والدہ سے وہ جائداد جو اسے ان کے والد دے گئے تھے، بخشوانے گئے اور وہ باہمت خاتون نہایت فیاضی سے، خاندانی مصلحتوں کی خاطر، اپنے حقوق سے دست بردار ہو گئی، تب بھی اس کا ذکر خطوں میں انھوں نے ”چھادنی“ کہہ کر نہایت کراہت سے کیا ہے !

اس واقعے نے گھر کی عام فضا پر اثر ڈالا۔ شبلی اور اس کے والد کے درمیان کئی موقعوں پر نکتہ در کے آثار ملتے ہیں۔ جب وہ تعلیم کی غرض سے لاہور گئے ہیں تو جس تنگی ترشی سے انھوں نے آٹھ دس روپے میں دو مہینے گزارے اور والد کو تکلیف نہ دی (”چوں مزاج عالی اند کے برہمی داشت“) اس سے باپ بیٹے کے بعد کے تعلقات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے سوتیلی ماں کی آمد کے بعد شبلی کی خانگی مسرت غرق ہو گئی لیکن اب بھی ایک میدان ایسا تھا جس میں ان کے لئے طمانیت و کامیابی کے پھول کھلتے تھے۔ اب ان کی تعلیم شروع ہو گئی تھی اور چونکہ وہ ذہین اور طباع تھے اور دل لگا کر پڑھتے تھے۔ اس لئے ہم چشموں میں ممتاز رہتے اور جو خوشی انھیں اپنے گھر میں نصیب نہ ہوتی تھی۔ وہ مدرسے کی چار دیواری میں مل جاتی۔

شبلی کی تعلیم چھ برس کی عمر میں شروع ہوئی اور اگرچہ ایک لحاظ سے اخذِ علوم کا سلسلہ تمام عمر جاری رہا لیکن ۱۸۷۷ء میں جب وہ حج کی

غرض سے روانہ ہوئے۔ ان کی رسمی تعلیم کا خاتمہ ہو گیا۔

مولانا نے کلام مجید اور فارسی کی کتاب میں اپنے گاؤں بندول میں پڑھیں۔ پھر اعظم گڑھ کے عربی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ چند روز جوہنور میں بھی پڑھا اس کے بعد، ان کے والد نے انھیں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے غازی پور بھیج دیا۔ مولانا کی اصل تعلیم کا زمانہ یہی تھا۔ یہاں سے فراغت کے بعد، مولانا نے اس زمانے کے دستور کے مطابق مختلف اساتذہ فن سے فیض حاصل کرنے کے لئے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ ایک مہینہ دیوبند رہے اور علم الفرائض کا ایک رسالہ پڑھا۔ کچھ عرصہ ام لپور میں گزارا اور مولانا ارشاد حسین سے فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کی۔ پھر لاہور گئے اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری پروفیسر اور ٹیبل کانج لاہور کی خدمت میں چند مہینے حاضر رہ کر عربی ادب کا صحیح مذاق پیدا کیا۔ اخیر میں حدیث کی طرف توجہ کی اور مولانا احمد علی سہارنپوری سے سنن ترمذی کا درس شروع کیا تھا کہ ان کے والد اور دوسرے اعزہ نے حج کا قصد کیا اور شبلی نے اپنے استاد کے اشارے سے اخذ علوم پر مذہبی ارکان کی بجائے اور ی کو ترجیح دی اور سہارنپور سے ممبئی روانہ ہو گئے۔

مولانا شبلی نے طلب علوم میں اپنا دامن دور دور تک پھیلایا۔ اور مختلف علوم، مثلاً ادب، منطق، حدیث میں جو جو اساتذہ اپنے فن میں تمام ہندوستان میں ممتاز تھے۔ ان تک سائی حاصل کی۔ اس ذہین و محنتی طالب علم نے ہر جگہ سے فیض حاصل کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک مہینے میں کسی درس گاہ کی خصوصیتیں اخذ کر کے موقع نہیں ملتا۔ اس دوران میں کسی علم کی ایک دھ شاخ کی تعلیم ہو جائے تو ہو جائے۔ لیکن ذہن اور طبیعت کی اصلاح ایک دو مہینے میں کس طرح کیجا سکتی ہے؟

چنانچہ شبلی پر دیوبند اور سہارنپور کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے ابتدائی اساتذہ میں سے (شاید سوائے مولانا فیض حسن کے جنہوں نے ان کے ادب عربی کے مذاق کو سنوارا) جس شخص نے ان کے دل و دماغ پر اپنی شخصیت کا گہرا نقش چھوڑا اور انہیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ وہ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی تھے۔

مولانا شبلی، ان کی نسبت لکھتے ہیں :-

”میں نے معقولات کی تمام کتابیں، مثلاً میرزا ہد - ملا جلال معرزاہد -

حمد اللہ - شرح مطالع - صد - شمس بازہ - ان ہی سے پڑھیں اور

میری تمام تر کائنات ان ہی کے افادات ہیں - فارسی کا مذاق بھی ان ہی

کا فیض ہے - اکثر اساتذہ کے اشعار پڑھتے اور ان کے ضمن میں شاعری

کے نکتے بناتے -

معقولات، جس میں مولانا محمد فاروق کو خاص طور پر دسترس تھی۔

عقلی و قیاسی علوم، مثلاً فلسفہ، منطق، کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے بلادِ

شرقی میں بے حد فروغ ہوا ہے۔ امام الہند شاہ ولی اللہ کے والد نے

ان علوم کے ایک مشہور ماہر، میرزا نیرا ہد ہروی سے تعلیم حاصل کی تھی۔

اور وہ خود بھی ان سے پوری طرح باخبر تھے۔ لیکن شاہ ولی اللہ نے جو

درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں ان علوم سے دانستہ و ناہی

برتی گئی۔ اس مساک کے بزرگوں کا خیال تھا کہ ان علوم میں غیر معمولی

سے انسان کو خیالی اور قیاسی بحثوں سے محبت ہو جاتی ہے اور ان کا جو

فائدہ ہے۔ وہ ظاہری ہے۔ باطنی اصلاح اور اخلاقی سر بلندی میں ان

سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح ہے کہ تفسیر و حدیث کے

مقابلے میں، جن پر شاہ ولی اللہ نے زور دیا۔ یہ علوم دنیوی علوم ہیں۔ انھیں مذہبی علوم سمجھنا یا اسلامی طریقہ تعلیم کا ضروری جزو بتانا محض حسن ظن ہے۔

معقولات سے جن حضرات نے بے اعتنائی برتی۔ ان کا طریقہ علمی معقول وجوہات اور ایک بلیغ حکمت پر مبنی تھا۔ لیکن اس کے باوجود سلا حکومت کے آخری دور میں ان علوم نے بے انتہا ترقی کی۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اگرچہ درس و تدریس میں ان علوم کو بنیادی اہمیت دینا بہت سی مصلحتوں کے خلاف تھا اور ان علوم کے ماہرین کو اپنی قیاسی بحثوں اور خیالی معلومات پر جو غیر معمولی ناز تھا۔ وہ تو بیجا اور علم و فن کے لئے ایک خطرہ تھا۔ لیکن ایک سمجھدار استاد کے ہاتھ میں یہ علوم طالب علم کی ذہنی تربیت کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ ان سے غور و فکر کی عادت راسخ ہو جاتی۔ خیالات کو باقاعدہ ترتیب سے پیش کرنے کی مشق ہوتی اور مخالفین کے بیان میں عیب نکالنے اور اپنا سکتہ بٹھانے کا نلکہ پیدا ہو جاتا۔

۱ مولانا فاروق کو معقولات سے غیر معمولی شغف تھا اور انھوں نے ہونہار شاگرد کو بڑی محنت اور محبت سے تعلیم دی۔ چنانچہ شبلی میں اگر ایک دوائی کو تاہیاں رہ گئیں جن سے معقولات کے مخالف ڈرتے ہیں۔ تو

لے ہندوستان میں معقولات کا اصل مرکز لکھنؤ کا فرنگی محل ہے لیکن وہاں علوم ظاہری کی تعلیم کے ساتھ باطنی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے وہاں معقولات کے وہ اثرات پوری طرح نظر نہیں آتے۔ جو شبلی کی ذات میں نمایاں ہوئے جو (اپنے استاد کی طرح) معقولات اور ظاہری علوم میں تو یہ طولی رکھتے تھے لیکن باطنی تعلیم اور روحانی تربیت یکسر محروم تھے۔

معتقوں کی ساری خوبیاں بھی ان میں موجود تھیں۔ مولانا فاروق کے زیر اثر ان کا ذہن بڑی ترقی کر گیا۔ خیالات میں ایک منطقی ترتیب آگئی اور مناظروں میں حریف کو نیچا دکھانے کی اہلیت پیدا ہوگئی بلکہ طبیعت پر ایک ایسا مناظرانہ رنگ غالب آگیا جو تمام عمر ان کی تحریر و تقریر کا مابہ الامتیاز رہا۔

مولانا محمد فاروق کی صحبت و تعلیم نے ہونہار شاگرد کے ذہن کو جلا دے دی لیکن شبلی کا وہ رنگِ طبیعت، جس پر بعد میں محتاط اور متقی، علما کی جماعت معترض ہوئی۔ اسی صحبت میں پرورش پاتا رہا اور شاگرد کے علاوہ استاد میں بھی جلوہ نہاتھا۔ مولانا فاروق اس زمانے کے مشہور عالم تھے۔ لیکن شبلی کی فطرت کی شنویت اور بوقلمونی ان میں بھی موجود تھی۔ وہ بہ یک وقت مذہبی عالم اور عدالتی وکیل تھے۔ مذہبی درسگاہوں کی بھی وہ رونق تھے اور فنِ موسیقی پر فریفتہ تھے۔ شیع علم کے بھی وہ شیدا تھے اور عشقبہ شرعی بھی خوب لکھتے تھے۔ مذہبی بحثوں میں بڑے جوش سے حصہ لیتے تھے۔ لیکن ارکانِ مذہب کی بجا آوری میں بقول شبلی ”خود بے پردا کھتے“

وہ خود ایک مشنری میں اپنی طبیعت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

نئے مینی کہ طرفہ بلبلم من	کزیں اعجوبہ ہر محفل من
ہر میدان نمودم ترکتازی	بخواندم نامہ تر کی و تازی
گئے از لوح لازمی خواندم حرف	گئے از حرف تازی بستہ ام طرف
گئے اندر مقام لحن شیراز	شدم با اہلی و سعدی ہم آواز
گئے در بزم گاہِ نغمہ سازی	سخن راندم با ہنگِ حجازی

۲۴
 حسودا! آں فروزاں گوہرِ مں کہ شیخِ مں بہ ہر بڑے بہت روشن!
 چنانچہ شاگرد پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا۔ جو بعد میں اس کی وساطت سے
 طلبائے ندوہ کو دراشت میں ملا اور جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے۔ شبلی
 کے لئے بڑی مشکلات کا باعث ہوا۔

شبلی کی قدامت پسندی کو بھی مولانا محمد فاروق کی صحبت نے بہت
 بھڑکا دیا۔ مولانا فاروق ایک بو قلموں شخصیت کے مالک اور ایک ہنرمند
 بزرگ تھے۔ لیکن انھیں زمانے کے نئے طور طریقوں سے بڑی نفرت تھی۔
 سرسید نے نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے جو تحریک جاری کی تھی مولانا
 محمد فاروق چریا کوٹی اس کے ”بڑے مخالفوں میں سے تھے۔“ حالی نے
 مستدسِ حالی لکھا۔ تو فاروق نے اس کے جواب میں مستدسِ عوالی ترتیب
 دیا۔ قرین قیاس ہے کہ اس ماحول میں شبلی کی قدامت پسندی کو بڑی
 تقویت ملی اور اگرچہ علی گڑھ جا کر وہ خود جدید تحریک سے وابستہ ہو گئے۔
 لیکن بالآخر ان کا ابتدائی ذوق غالب آیا اور جدید کے خلاف قدیم کو
 مستحکم کرنے میں اُنھوں نے وہ کام کیا جو مولانا محمد فاروق کے خواب و
 خیال میں بھی نہ تھا!

مولانا محمد فاروق کو اپنے شاگرد پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے آپ کو
 عرینِ دانش کا شیر اور شاگرد کو بچہ شیر کہتے تھے۔ اُستاد نے فخریہ شاگرد
 کا سبب کہا۔ اَنَا اَسَدٌ وَاَنْتَ شَبَلٌ یعنی میں شیر ہوں اور تو شیر کا بچہ۔

۱۹۰۷ء میں جب مولانا شبلی کا پاؤں کٹا۔ تو مولانا محمد فاروق نے ایک فارسی
 مثنوی میں ”بڑے پیار اور محبت سے اپنے شاگرد کی بیماری پر مری کی“ اس کا
 ایک شعر ہے نہ تیر از جرخِ خود پسند رسید شبلی انت را بہ پاگزند رسید
 شبلی ات کی ترکیب سے اُستاد کے جوشِ محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے

اسی فقرے سے اُستاد و شاگرد کے تعلقات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مدرسے کی چار دیواری میں یہ جو ہر قابل کس طرح چمک رہا تھا۔

علامہ شبلی نے فقط درسی کتب پر اکتفا نہیں کی بلکہ عام کتب بینی کا وہ شوق جو ان کے لئے سرمایہ حیات ہونے والا تھا۔ ابتدائے شروع ہو گیا تھا۔ وہ بچپن میں ہی فرصت کے اوقات شہر کے ایک کتب فروش کی دکان پر بسر کرتے۔ کتابیں اُلٹے پلٹے۔ شعرا کے دیوان پڑھتے اور مناسباً طبع سے انھیں اچھے اشعار یاد رہ جاتے۔

شعر گوئی بھی اس عمر میں شروع ہو گئی تھی۔ ان کے سب سے پہلے معلم کا بیان ہے کہ ایک رات کو وہ سوئے ہوئے تھے۔ قریب ایک بجے کا وقت تھا۔ یک بیک جو ان کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ مولوی شبلی ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک قطعہ تاریخ کی تصنیف ہو رہی ہے!!

۱۔ مولانا کے مذاق شعر گوئی کی اصلاح و تربیت اس وقت ہوئی۔ جب وہ مولانا محمد فاروق کے حلقہ دُرس میں آئے۔ مولانا غازی پور میں اُستاد کے پاس ہی رہتے تھے۔ پھر شاگرد کی کشش اُستاد کو اعظم گڑھ لے آئی۔ دونوں میں اُستاد اور شاگرد کا رسمی تعلق نہ تھا بلکہ حد درجہ دل بستگی اور مذاق کی یگانگت تھی۔ مولانا محمد فاروق نہایت شمسۂ ناری شعر کہتے تھے۔ موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ انہی صحبت میں مولانا کو فارسی شعر گوئی کا پاکیزہ مذاق حاصل ہوا اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کے اس زمانے کے فارسی اشعار اُردو اشعار سے بہتر ہیں۔ لطیفہ۔ مولانا محمد فاروق اور شبلی کی نسبت ایک واقعہ بیان کیا

جاتا ہے۔ جن سے دونوں کی بے کھفی اور شبلی کی حاضر جوابی (اور انانیت!) کا اندازہ ہوگا۔ ایک دفعہ شاگرد ننگے سر بیٹھا تھا۔ استاد نے پیچھے سے آکر سر پر ایک ہلکی سی چپٹ لگائی اور مذاق سے کہا:
ہے گاچپٹ گاہِ خلّاق یہ سر
شاگرد نے فوراً جواب دیا:

جتنے ہیں سران پہ ہے فالق یہ سر
۱ مولانا محمد فاروق فقط ایک معقونی اور شاعر نہ تھے۔ ایک زبردست ادیب بھی۔ اخیر عمر میں جب ندوہ میں ان کا تقرر ادیبِ اوّل کی حیثیت سے ہوا۔ تو اندوہ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا: ”ہندوستان میں مولانا علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ علم و ادب سے یہ دلچسپی اور ادبیانہ رنگ مولانا کے فخر استاد شاگرد شبلی کو بھی ملا بلکہ شاید یہ کہنا سچا نہ ہو کہ برخلاف علی گڑھ کے جہاں علم جدید کی تعلیم ہوتی ہے اور دیوبند کے جو مذہبی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ شبلی کے ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین کا مابہ الامتیاز وہ ادبی رنگ ہے۔ جو مولانا محمد فاروق کی عربی اور فارسی، تحریر و تقریر میں جھلکتا تھا اور جسے ان کے لائق شاگرد نے بڑی اصلاح و اضافہ کے بعد اردو میں منتقل کیا۔“

۲ افسوس کہ مولانا محمد فاروق کے حالات و تصنیفات جمع کرنے کی پوری کوشش نہیں ہوئی۔ شبلی نے ندوہ میں ایک مختصر سا نوٹ لکھا تھا۔ سید سلیمان ندوی نے اس پر اضافہ کیا ہے لیکن ان کے حالات میں ایک مستقل مضمون کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ بالخصوص اگر ان کا مستند عوالی، جو انھوں نے مستند حالی کے جواب میں لکھا تھا۔ شائع کر دیا جائے۔ تو ان کے رنگِ طبیعت اور شبلی کے ابتدائی ماحول پر اور روشنی پڑے۔
(بانی صفحہ آئندہ پر)

مولانا شبلی نے طلب علم کی منزلوں میں بڑھ چڑھ کے قدم مارا تھا اور انھیں اس راہ کے طے کرنے میں وہی مسرت حاصل ہوتی تھی جو ایک عاشق صادق کو دیارِ محبوب کی سیر میں ملتی ہے۔ لیکن قدرت کی قسم ظفری (بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ)

ہم مولانا شبلی کی ابتدائی ادبیانہ تربیت کے پوری طرح معترف ہیں اور سید سلیمان سے اس بات میں متفق ہیں کہ علی گڑھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں انشا پر دازی کا بڑا زور آگیا تھا لیکن ہمیں خفیف سا خیال ہے کہ مسئلہ قراۃ خلف الامام کے جس رسالے پر سید سلیمان نے اپنے دعوے کی بنیاد رکھی ہے۔ شاید وہ شبلی کا نہ تھا بلکہ ان کے استاد کا تھا۔ اس شبیہ کے وجہ بالا اختصار یہ ہیں (۱) جیسا کہ سید سلیمان خود بتاتے ہیں شبلی نے اس زمانے میں ”اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے ناموں سے تحریریں اور رسالے لکھے۔ اس زمانے میں شاگردوں کے نام سے (بالخصوص اختلافی مسائل میں) رسالے شائع کرنا عام بات تھی (۲) رسالہ کی طباعت کے وقت شبلی کی عمر فقط ۱۶ سال کی تھی اور ان کے قلم سے یہ رسالہ بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے (۳) ایجاز و اختصار کا جو شبلی کے طرزِ تحریر کی شروع سے خصوصیت رہے ہیں۔ (مثلاً ان کے تمام ابتدائی فارسی مکاتیب میں) اس رسالے میں کوئی سراغ نہیں۔ بلکہ طرزِ تحریر بالکل اس کے برعکس ہے (۴) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب شبلی سے ایک زمانے میں پوچھا گیا کہ ان کی سب سے پہلی تصنیف کونسی ہے تو انھوں نے ایک عربی رسالہ اسکات المعتمدی کا حوالہ دیا۔ اور اس کے بعد ”مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم“ کا جس پر انھوں نے ۱۸۸۷ء میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ (مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۲۳۵)

قرین قیاس ہے کہ اگر مسئلہ قراۃ خلف الامام والا رسالہ شبلی کا اپنا ہوتا تو وہ اس کا ضرور ذکر کرتے۔

دیکھئے۔ مولانا کی قیمت میں نہ تھا کہ کسی چیز سے انھیں دوامی مسرت حاصل ہو۔ وہ اپنے لئے عیش و طرب کا جو جام تیار کرتے یا تو وہ جام ہی ان سے چھن جاتا یا بادۂ مسرت زہرِ تلخ کام میں بدل جاتا۔ انھوں نے تمام تعلیم قدیم مدارس میں حاصل کی تھی جس وقت وہ مکتب میں گئے۔ اس وقت یہی نظام تعلیم مقبول تھا۔ ان کے والد بقول سید سلیمان ندویؒ ”اس زمانہ تک نئے زمانہ کی آب و ہوا سے نا آشنا تھے“ لیکن اس سے کچھ عرصہ بعد ایک شخص سید احمد خاں نامی غازی پور اور بنارس میں سبج ہو کر آیا اور اُس نے بچوں کو نئی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ قرب مقامی کی وجہ سے اس نے اعظم گڑھ میں بھی کئی لکچر دئے اور شبلی کے والد اس کی تحریروں و تقریر سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے شبلی کے سوا باقی سب بچوں کو انگریزی طرز کے اسکولوں میں داخل کیا۔ ایک کو ولایت تک بھیجا اور باقیوں کو بھی کالج کی تعلیم دی۔

اب مولانا شبلی اپنے گھر میں یکہ و تنہا قدیم تعلیم کے ترجمان تھے۔ انھوں نے اس طریق تعلیم کی سب سے اونچی چوٹیوں کو سر کیا تھا اور اس پر انھیں بڑا ناز تھا۔ لیکن اب ان سے کہا جا رہا تھا کہ ان چوٹیوں کے سر کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جو کچھ ہے۔ نئی تعلیم ہے۔ شبلی کے حماس دل پر اس کا جو اثر ہوتا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ نئی تعلیم کی مقبولیت نے ان کی مسرت و طمانیت کے ذہن میں اسی طرح آگ لگا دی۔ جس طرح سوئلی ماں کی آمد نے ان کے خانگی سکون کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا اور اب نئی تعلیم کی نسبت ان کے

لے ”مولانا (شبلی) کے لئے شیخ (حبیب اللہ) صاحب کے خیالات میں یہ جدید تغیر و تحول

سوانح روح کا باعث تھا“ [سیرت شبلی از مولوی اقبال احمد سیال]

دل میں وہی خیالات تھے جو سوتیلی ماں کی نسبت تھے اور جب حصولِ تعلیم کے بعد انھیں ایک عرصے تک تلاشِ ملازمت میں ٹھوکریں کھانی پڑیں تو یہ غم و غصہ اور گہرا ہو گیا۔

وہ ایک خط میں، ان عزیزوں کی نسبت جو انھیں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ جل کر لکھتے ہیں۔

عزیزان گویند کہ بغیر از تعلّم انگریزی نخواہی بسر برد ایں خود چہ حرف است
جمعے راہیں کہ بیچ از انگریزی خواندہ اند۔ و باز بناسب جلیلہ سے رسد۔

اور فی الواقع انھیں تلاشِ روزگار میں جو صعوبتیں اُٹھانی پڑیں۔ انھیں دیکھتے ہوئے اس بات پر حیرانی بھی نہیں ہوتی کہ اس زمانے میں ان کے غم و غصہ کی ایسی حالت کیوں تھی؟

عنقوانِ شباب

جج سے واپسی کے بعد بھی، شبلی ابھی طلبِ علم کے کوچے کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے مگر ان کے والد مقرر ہوئے کہ وہ اب کتابوں کو چھوڑ کر دنیوی زندگی میں قدم رکھیں۔ مولانا نے علم و فن سے اپنا سلسلہ بالکل منقطع تو نہ کیا لیکن انھیں والد کے حکم کے سامنے سر جھکانا پڑا اور تلاشِ روزگار کی کٹھن منزل شروع ہوئی۔ جب دو تین سال تک بھٹکنے کے بعد کوئی ٹھکانہ نہ ملا تو مولانا کے والد نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ وکالت کا امتحان پاس کر کے، اعظم گڑھ میں وکالت شروع کریں۔ چنانچہ شبلی نے تیاری شروع کی اور ۱۸۷۹ء میں وکالت کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن وہ پہلی مرتبہ ناکام رہے اور خدا کی قدرت، اُن کا چھوٹا بھائی مہدی، جسے وہ اپنی کتابوں کے مضامین سنایا کرتے تھے۔ اور جو محض تفریحِ طبع کے طور پر امتحان میں بیٹھا تھا کامیاب ہو گیا!

مولانا کی حساسِ طبیعت کے لئے یہ ایک اور چرکا تھا۔ اگلے سال انھوں نے زیادہ محنت اور باقاعدگی سے امتحان کی تیاری کی اور کامیاب ہو کر اعظم گڑھ میں وکالت شروع کی لیکن وہ طبعاً مغرور اور کم آئینہ تھے اور اس سے ایک سال بعد لکھتے ہیں۔ ”من کہ از آشفته سری و شور یہ مزاجی تن بہ آئینہ شکرے نئے دادم“ (وکالت میں اس طبیعت کے ساتھ کامیابی ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے وکالت، والد کے حکم کے مطابق طوعاً و کرہاً شروع کی تھی۔ انھیں اس سے کوئی ذاتی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ ان کی

وکالت نہ چلی اور کچھ عرصے کے بعد انھیں یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔

وکالت سے باپوسی کے بعد شبلی نے سرکاری ملازمت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس وقت کلکٹر کی کچھری میں دس روپے کی نقل نویسی عارضی طور پر خالی تھی اور مولانا کا اس پر تقرر ہوا۔ اس کے بعد قرقابین کی سائی خالی ہوئی تو شبلی کو دو مہینے کے لئے وہ جگہ دی گئی۔ مولانا نے اپنا کام بڑی محنت سے کیا لیکن یا تو وہ اسامی عارضی تھی یا شبلی سرکاری ملازمت کے لئے ہی موزوں نہ تھے۔ انھیں کارگزاری کی کوئی داد نہ ملی بلکہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ان کے تقرر کا ہی حکم جاری نہ ہوا!

جب سرکاری ملازمت بھی ایک سراپ ثابت ہوئی (اور مولانا پچیس سال کی عمر تک پہنچ جانے کی وجہ سے قواعد کی رو سے ہی مستقل ملازمت کے اہل نہ رہے) تو ان کے والد نے انھیں اپنے کام پر لگایا۔ شیخ حبیب اللہ وسیع پیمانے پر نیل سازی کی تجارت کرتے تھے اور ان کے اطراف میں کئی گودام تھے۔ انھوں نے ایک گودام کی نگرانی مولانا کے سپرد کر دی۔ یہ کام مولانا کو سخت ناگوار تھا اور کچھ عرصے کے بعد وہ اسے ترک کر کے گھر واپس چلے آئے۔ اتفاق سے اس زمانے میں مولوی محمد علی صاحب ولید پوری جو ضلع بستی میں منصف تھے۔ اعظم گڑھ آئے اور مولانا کی بے شغلی دیکھ کر انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں مولانا نے چند مہینے بستی میں وکالت کی۔

تعلیم سے فراغت اور حصول روزگاہ کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر ایک کشمکش اور اُمید و بیم کا زمانہ ہوتا ہے اور شبلی کو جن حالات سے سابقہ پڑا وہ تو غیر معمولی طور پر افسوس ناک اور مایوس کن تھے۔

لیکن ان کی ہمت کی داد دینی چاہئے کہ ان نامساعد حالات میں بھی وہ ایک لمحہ کے لئے اپنے درخشاں مستقبل سے باہوس نہیں ہوئے۔ شبلی کے جاننے والے انہیں شکبر اور خود پسند سمجھتے تھے لیکن ایک تو قدرت نے انہیں جو صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ ان کی بنا پر یہ تکبر بجا نہ تھا اور پھر خود کو پسند انسان کو ہمت شکن حالات کے سامنے سر جھکانے سے بچانی ہے وہ ایک بُرائی نہیں۔ خوبی ہے۔

شبلی نے اس زمانے میں درد کی ٹھوکریں کھائیں وہ نہایت معمولی کامیوں پر ناکام رہے تھے۔ ان کے حساس دل پر ان ناکامیوں کا جو اثر ہوتا ہوگا۔ وہ ظاہر ہے۔ ان کے زمانے کے خطوط رنج و الم اور بے چینی سے پُر ہیں لیکن غموں کی اس تاریک گھٹائیں بھی ان کی ہمت اور خود اعتمادی کا ماہتاب روشن رہا۔ وہ اس زمانے میں بھی جب انہیں پندرہ روپے کی قرق امینی کے ناقابل سمجھا گیا۔ لکھتے ہیں :-

من خود میں خیال از کشمکش و آویزش فکر فارغ نشسته ام کہ با اینہم خیر اریا
 ہاں شبلی ام کہ بودہ ام و اگر گاہے بختم یادری کرد۔ ہماں خواہم بود کہ ہستم۔
 شبلی سمجھتے کہ نقل نو مہی اور قرق امینی میں ان کی ناکامی اس وجہ سے
 نہ تھی کہ ان میں قابلیت کی کمی تھی بلکہ اس کا باعث یہ تھا کہ ان چیزوں سے
 انہیں کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ مرغوں اور مرغیوں کی مناسبت میں اگر بلبل
 خوش الحان کو کوئی انعام نہ ملے تو اس سے اُس کی خوش الحانی میں فرق نہیں
 آجاتا۔ شبلی کی تمام دلچسپیاں علمی اور ادبی تھیں اور وہ اس وقت کا انتظار
 کرتے رہے۔ جب خوش قسمتی سے قدرت نے ان کے مذاق کے مطابق ان کے
 روزگار کا انتظام کر دیا۔

اس دوران میں وہ اپنے والد کی خوشنودی کے لئے تلاشِ روزگار میں مشغول رہے لیکن انھوں نے اپنی علمی اور ادبی دلچسپیاں بھی برقرار رکھیں اور یقیناً ان سے اس رنج و ناکامی کے عالم میں دل کو تسکین اور قرار ملتا ہوگا تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے اپنے اقارب اور دوستوں کو بعض کتابچے بھیجے ہیں لیکن اس زمانے میں ان کا سب سے بڑا مشغلہ مناظرہ بازی اور غیر مقلدوں کی مخالفت تھا۔

اس زمانے میں اہل حدیث کا فرقہ نیا نیا شروع ہوا تھا اور ان کی مخالفت اور موافقت میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ شبلی کے استاد مولانا محمد فاروق ایک خالی حنفی تھے پتہ نہیں۔ ان کی صحبت کا اثر تھا یا قدرت کو یہی منظور تھا کہ ہر اصولی بات میں یہ نوجوان جدید کے مقابلے میں قدیم کی حمایت کرے۔ شبلی بھی غیر مقلدوں (اہل حدیث یا وہابیوں) کے سخت مخالف ہو گئے بلکہ حنفیت کے جوش میں اپنا لقب ہی نعمانی اختیار کیا۔

شبلی شدید احساسات کے انسان تھے۔ وہ جب کسی چیز کے حق میں ہوتے تو اسے آسمان تک پہنچا دیتے اور جب مخالفت شروع کرتے تو بسا اوقات اعتدال اور انصاف سے آنکھیں بند کر لیتے۔ چنانچہ ان کا اس زمانے کا ایک قول معارف میں نقل ہوا ہے کہ ”انسان عیسائی ہو سکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہو سکتا“ اس زمانے میں اعظم گڑھ کے ضلع میں تقلید اور غیر تقلید کا خاص طور پر چرچا تھا جب مولانا یسین پلے کہ ضلع کے کسی گاؤں میں کوئی شخص غیر مقلد ہوا ہے یا کوئی غیر مقلد باہر سے آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرے کا جلیغ دیتے!

لیکن مولانا کے عنفوانِ شباب کے سارے مشغلے ٹھیکے مولویانہ قسم کے نہ تھے۔ ان میں ایک شدید شاعرانہ حس بھی تھی۔ خدا نے انھیں دل گرم اور طبع موزوں عطا کی تھی۔ شعر گوئی انھوں نے اس زمانے میں شروع کی تھی۔ جب وہ ابھی مدرسے میں اسجد خوانی کرتے تھے سید سلیم نے اس سلسلے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ ایک مرتبہ مولانا کو کچن میں اوڑھنے کے لئے چادر کی ضرورت پڑی۔ مولانا کے والد شہر کے رئیس تھے۔ شبلی کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ ایک رئیس کے بیٹے کو چادر نہ ملے۔ انھوں نے باپ سے زبانی کہنے کے بجائے یہ شعر کاغذ پر لکھ کر پیش کیا

پدر جس کا یوں صاحبِ تاج ہو !
پیر اس کا چادر کو محتاج ہو !

باپ بہت خوش ہوئے اور بیٹے کو چادر انعام دی !
مولانا شبلی کے مذاق شعر گوئی کی اصلاح، اُن کے محسن اور جہاں نشا استاد، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی نے کی لیکن ان کی ابتدائی اردو شاعری پر سب سے زیادہ اثر اودھ پنچ اور پیام یار کا تھا۔ اودھ پنچ ۱۸۸۵ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ اس طبقے کا ترجمان تھا جس کا خیال تھا کہ ہندوستان، بالخصوص لکھنؤ اور اودھ کی ہر ایک چیز بے عیب ہے۔ اور اس میں کسی اصلاح یا تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ ایک عرصے تک اس اخبار نے جالی کی جدید شاعری کو اپنی تمسخر نگاری کا تختہ مشق بنا رکھا اور بڑے فخر سے کہا

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

سرسید کی اصلاحی تحریک کے خلاف اس اخبار میں اکبر الہ آبادی اور دوسروں نے جو کچھ لکھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ مولانا شبلی قدیم کے دلدادہ تھے۔ وہ اس اخبار کو بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ اس میں چھپی ہوئی بعض طویل نظمیں انھوں نے یاد کر رکھی تھیں اور اخیر عمر تک اپنے منتخب شاگردوں اور یارانِ طریقت کو سُنا یا کرتے تھے۔

اس زمانے میں مولانا کا دوسرا دلپسند رسالہ لکھنؤ کا پیام بار تھا۔ یہ غزلیات کا ایک مجموعہ تھا جسے منشی نثار حسین نکالا کرتے تھے۔ منشی صاحب شیلو کے بے تکلف دوست تھے اور چوک میں ان کی عطری دکان تھی۔ مولانا جب لکھنؤ جاتے تو شام کو منشی صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ بے تکلف احباب کے ساتھ خوش گپیاں کرتے۔ منشی نثار حسین سے مولانا کی دوستی دیرینہ پرقرار رہی اور ان کی دو تصانیف 'مثنوی صبح اُمید' اور 'مسلمانوں کی کدہ تعلیم' منشی صاحب کے ذریعہ سے شائع ہوئیں۔

اودھ پنچ اور پیام یار دو ایسے پرچے تھے جن سے ایک مذہبی عالم کا تعلق خاطر بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہو گا لیکن مولانا فقط ایک مذہبی عالم نہ تھے۔ وہ ایک شاعر بھی تھے اور ان کی شخصیت میں ایسے عناصر موجود تھے جن کی ان پرچوں سے تسکین ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جہاں تک ہمیں نظر آتا ہے۔ ان پرچوں سے مولانا نے کوئی نیا، ناخوشگوار اثر اخذ نہیں کیا۔ ان کے مطالعہ سے ان کی زبان میں شگفتگی آگئی۔ خیالات میں تنوع پیدا ہو گیا۔ لیکن وہ خود ان رسالوں کی سقیم رندانہ فضا سے متاثر نہ ہوئے۔ مولانا میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ قعرِ دریا میں غوطہ زن ہونے کے بعد باوجود اپنا دامن تر نہیں ہوتے دیتے تھے۔ وہ خود ایک

اہم خط میں، جو نومبر ۱۹۲۳ء کے معارف میں شائع ہوا۔ لکھتے ہیں:-
 بچپن سے میری صحبت بدچلن لوگوں میں تھی اور وہ لوگ ہمیشہ شائع
 کی تحریک کرتے تھے لیکن کبھی ناتجارت، بلکہ کانے میں بھی شریک نہ ہوا۔
 مولانا کی اس زمانے کی اردو غزلوں میں کوئی خاص بات نہیں رسمی
 عاشقانہ اشعار ہیں۔

ضعف میں بھی یہ مکر تیر فغاں کا زور ہے روک لے اس کو کہاں آسمان میں زور ہے
 نیست تھلی سکی کمر پر تو نے ثابت کر دیا واہ واہ سنیم کیا تیرے بیان میں زور ہے
 شردانی صاحب کے خط میں ایک اور شعر نقل ہوا ہے۔
 بخودی وصل کی، حظ کب مجھے لینے دیتی

وہ جواتے بھی، تو میں آپ سے باہر ہوتا ہا
 ایک طویل نظم اعظم گڑھ کے کسی انگریز افسر کو خوش کرنے کو لکھی گئی۔
 اس میں انگریزوں کی فتح کا بل و قندھار کا حال ہے۔
 لوسنوتیخ و سناں کی داستان رايت و طبل و نشاں کی داستان
 پہلوانانِ جہاں کی داستان شاہ کے اعزاز و شاں کی داستان
 حکمرانِ بکرو بر کی فتح ہے
 قیصرِ ہند و سناں کی فتح ہے

شبلی کا ابتدائی اردو کلام معمولی ہے لیکن ان کے زمانے کے فارسی کلام
 میں کئی چیزیں ایسی ہیں جو شاعر کی آئندہ عظمت کا پتہ دیتی ہیں یا جن سے
 اس زمانے کی جذباتی و اردو اتوں کا سراغ ملتا ہے۔ ایک دلچسپ نظم وہ
 ہے۔ جسے شبلی نے دیوان مرتب کرتے وقت قلمزد کر دیا لیکن جسے ان کے
 عقیدت مند شاگردوں نے برگِ گل میں شائع کیا ہے۔ اس میں غالب کی

خاص واقعہ کی طرف اشارہ اور کسی خاص شخص سے خطاب ہے۔

اے پسر از چہ رمیدی از ما ؟ بازگو تا کہ چہ دیدی از ما ؟
گفتہ ترک وفا یعنی چہ ؟ بافتی نرد وفا یعنی چہ ؟
گر چہ دور از تو چہ دیدستم ہم بران عمد و مواعید مستم
تو بیک دم زدن اے سے رخسار گشتہ چوں من از من بزار
وقتہا بزم سخن ساختے طرح بیت و غزل انداختے
من بہ تو بادل ماتم زدہ خستہ ، سوختہ ، غم زدہ
بے حجابانہ ہم از سر ذوق عرض مے داشتے حالتِ شوق
ہم تو بابتدہ بجوشِ مستی
عہد و پیمان وفائے بستی!

اے چہرہ نازکت گل تر زلفِ سیہ تو سنبل تر
اے لعل تو سحر ساز کردہ چشمت درِ فتنہ باز کردہ
زود آئے کہ آتشِ غم سوخت دیں شعلہ فرق تا قدم سوخت
دور از غم تو بہ آہ و زاری فریادِ کُنم زبے قرارِ
در ہجر تو نگاہِ بادمِ سرد ایں تازہ غزلِ سرایم از درد

لے غالباً یہ نظم مولانا کے اس کلام میں تھی جو ان کے لڑکپن کے نہایت عزیز دوست اور شاگرد مولوی محمد سمیع کے پاس جمع تھا۔ شبلی نے ترتیب دیوان کے وقت ۱۸۸۴ء کے ایک خط میں مولوی صاحب کو لکھتے ہیں۔ ”فارسی کے نامے اور غزلیں وغیرہ جو تمہارے پاس ہیں۔ نہایت جلد بھیج دو“ مولانا شبلی سے مولوی محمد سمیع کے تعلقات پر سید سلمان ندوی نے کتاب ”مولانا شبلی“ میں روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ”مولانا سے ان (مولوی سمیع) کو نہایت محبت تھی بلکہ عشق تھا۔“

کالے رشک گل و سمن کجائی دے تازہ بہارِ من کجائی
 بے تو ہمہ شب نائیدم خواب افسانہٴ مرد و زن کجائی
 شبلی بہ غم تو مے سراپد
 کالے راحتِ جان و تن کجائی!

ایک اور دلچسپ غزل اُنھوں نے اس وقت لکھی جب وہ ابھی تسنیم
 تخلص کرتے تھے۔ یہ غزل فقط دو تین گھنٹوں میں لکھی گئی اور اس سے
 ان کی قدرتِ شعر گوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

نگاہ ہے بر من مسکینِ خدا را کہ گاہے شاہ بنوازد گدا را
 فغاں کز بہرِ ناب و صبر و آرام غمت نگذاشت در دل ہیج جا را
 نہ یاد آری کچھ از خستہٴ خویش فراموش ساختی حرفِ وفا را
 سخن را رہ نہ باشد دردِ دہانت ز تنگی ہمجو در غنچہٴ صبا را
 کجا در بارِ گاہش بارِ بخشد

چو تسنیم غریب بے نوا را
 ایک اور پُر اثر غزل کسی زمانے میں اعظم گڑھ کو چھوڑتے وقت لکھی
 گئی۔

تائید پنداری کہ خرم میر ویم از وطن با چشمِ پرِ غم مے رویم
 از گدا ز شعلہٴ غم ہمجو شمع بزم ہارا کردہ بر ہم مے رویم
 از فریبِ مارِ گیسوے کسے زیں جہاں مانند آدم مے رویم
 خفتہٴ پاسِ چند بر دامنِ گل زیں گلستان ہمجو شبنم مے رویم

شبلیا از گردِ دشتِ گردِ دینِ دُوں
 دوستان رفتند و ما ہم مے رویم

ان کے علاوہ شبلی کے وہ اشعار بھی ذکر کے قابل ہیں جو انھوں نے ۱۸۷۷ء میں جنگ ترکی و روس کے موقع پر لکھے۔ اس لڑائی نے ہندوستان میں بڑا جوش پیدا کیا تھا اور ترکی کے لئے جا بجا چندہ ہوا۔ مولانا محمد قاسم سرپرست دارالعلوم دیوبند نے اس تحریک میں بڑا حصہ لیا۔ اس زمانے میں حکومت انگلشیہ روس کو اپنا حریف سمجھتی تھی۔ اس لئے سرکاری حلقوں میں بھی یہ کوششیں سختان کی نظروں سے دیکھی گئیں۔ اس وقت مولانا شبلی کی عمر کوئی اکیس سال کی تھی لیکن وہ اس لڑائی سے بڑے متاثر ہوئے۔ اعظم گڑھ میں انھوں نے چندہ جمع کیا اور کوئی تین ہزار روپے ترکی کو بھیجے گئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سلطان عبدالحمید خاں کی تعریف میں فارسی اور اردو قصیدے بھی لکھے جو شاعرانہ نقطہ نظر سے بلند رتبہ نہ سہی لیکن جن سے مولانا کی ترکی سے اس محبت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو آگے چل کر بھڑک اٹھی اور اسلامی ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر اپنا نقش یادگار چھوڑ گئی۔

عنفوانِ شباب کے کلام میں جس چیز پر شبلی نے سب سے زیادہ زور طبع صرف کیا ہے۔ وہ ایک نعتیہ قصیدہ ہے۔ جس میں طرح طرح کے صنائع بدائع ہیں اور طرز بھی کسی قدر الوکھی ہے۔ اس میں اپنا درود دل بڑے پُر اثر طریقے سے بیان کیا ہے اور ان کی اس زمانے کی مزاجی کیفیت کا اس قصیدے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ بعض بند ہیں یہ
 بنگر کہ چوں دیر ہنے از دانہ کرم خرمنے ہم اندکے وز گلبنے، آراستم صد گلشنے
 گردوں نذر دچوں منے، فضل ہنر امانے اینک بفر دشنے رشیمیم در ہرا سخن
 بازم بایں خواری نگر دگر دگر بزار ی نگر حال نہ کار ی نگر و زچین خون خواری نگر

خونیش دل آزادی نگر و زنجت بیداری نگر
 دیو سی آنکھوں میں خوش کردہ ام کج غم
 ہموار خونباری نگر اندھیم خوں بالائے من
 نے مونے نے ہمدے تارا دل گویم دے
 زخمِ دلم را مر ہے، بود دریں بیت النحر
 چوں لالہ ام خوں شد جگر از اسازی بخت نگر
 کاندہ جین حالے بتر ہر دم دہد داسے دگر
 از من کہ بگذازد خبر دہم اس شاہ ز من
 شبلی کے لئے یہ انتہائی کوفت اور کشمکش کا زمانہ تھا لیکن رات کی انتہائی

تاریکی کے بعد صبح صادق کا ظہور ہوتا ہے۔ عین اس وقت جب وہ ہر
 طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ مغرب کی طرف سے شعاعِ امید چکی شبلی نے
 اس کا تعاقب کیا اور وہ انھیں ایک ایسے راستے پر لے گئی جو انھیں ترقی
 اور شہرت کی انتہائی سر بلندیوں پر پہنچانے والا تھا۔

۸۸۲ء میں علی گڑھ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی سہ ماہی
 خالی ہوئی۔ شبلی نے بھی اس کے لئے عرضی دی اور مولانا فیض الحسن
 سہارنپوری کی سفارش ساتھ بھیجی۔ سرسید مولانا فیض الحسن سے عربی ادب
 کی بعض کتابیں پڑھ چکے تھے اور ان کا اتنا ادب کرتے تھے کہ جب
 وہ پنجاب کے سفر میں گئے اور ایک جلسے میں مولانا فیض الحسن نے کھڑے
 ہو کر اپنے نامور شاگرد کی تعریف میں ایک عربی قصیدہ پڑھنا چاہا تو
 سرسید نے ان کے ہاتھ سے کاغذ پھین لیا اور کہا کہ آپ کی یہ تحریر
 ویسے ہی میرے لئے دستِ افضلیت ہے۔ میں آپ کو کھڑے ہو کر اس کے
 پڑھنے کی تکلیف نہیں دے سکتا!

شبلی نے ایک ایسے شخص کی سفارش بھیجی تھی۔ پھر سرسید بھی ان سے
 نا آشنا نہ تھے کیونکہ اس سے ڈیڑھ سال پہلے ان کا ایک عربی قصیدہ علی گڑھ

نَزٹ میں چھپ چکا تھا۔ علم و فضل کے سارے جوہران میں موجود
 تھے۔ سرسید کے دستِ راست مولوی سمیع اللہ کی بھی ان کو امداد
 حاصل تھی۔ چنانچہ اس اسامی کے لئے ان کا انتخاب ہوا اور ۱۸۸۲ء
 کے آخر میں وہ علی گڑھ روانہ ہو گئے :-

علی گڑھ

شبلی نے یکم فروری ۱۸۸۳ء سے علی گڑھ کالج میں کام شروع کیا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض اقربا اس تعلق کے خلاف تھے۔ بالخصوص ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ جم کروکالت کریں لیکن مولانا قسندرہ روپے کی قرق امینی کو وکالت پر ترجیح دیتے تھے۔ وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ وہ علی گڑھ جانے کے بعد ایک خط میں اپنے چچا کو لکھتے ہیں :-

والد قبلہ راجزہ وکالت روئے وراہے نیست۔ ویاں آزادہ دلی اگر وکالت

درساختہ باشم۔ در نظر انصاف مرادیں میانہ گناہے نخواہد بود۔

اس کے علاوہ اگرچہ وہ علی گڑھ کے چالیس روپوں کو اپنے اور اپنے خاندان کے رتبے سے فرو تر سمجھتے تھے لیکن انھیں اُمید تھی کہ یہ تعلق ان کی آئندہ عظمت کا پیش خیمہ ہوگا۔ فرماتے ہیں :-

ایں جا کہ آرمیدہ ام وایں مذلت برخوش پسندیدہ۔ ندالم کتاچنخ رادیں

پدرہ چہ نیز نگہاست۔

فی الواقع ان کا اپنے والد سے اس معاملے میں اختلاف بجا تھا۔ ان کی اپنی ذہانت اور محنت اور ان کے والد کے ثور و سوخ سے بیخیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر وہ وکالت میں ثبات و استقلال سے کام لیتے تو بالآخر ان کی وکالت چل نکلتی لیکن پھر بھی کیا ہوتا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنے والد کی طرح ایک کامیاب وکیل ہو جاتے لیکن آج اُن کے والد کو لوگ کیوں جانتے ہیں؟

صرف شبلی کے انتساب کی وجہ سے شبلی نے اپنے آپ کو علمی زندگی کے لئے وقف کر کے زیادہ روپیہ نہ کمایا ہو لیکن انھوں نے وہ سربلندیاں حاصل کیں جو ان کے والد کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔

پھر علی گڑھ کی ملازمت کو فقط سیم و زر کے نراز میں تو لانا صحیح نہیں۔ علی گڑھ میں شبلی کی زندگی کا دوسرا طالب علمانہ فوار شروع ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے وہ چیزیں سیکھیں جو انھیں ایک عام معقولی عالم سے ممتاز کرتی ہیں اور ان کی علمی سربلندی کا ذریعہ بنیں۔

جس وقت شبلی علی گڑھ پہنچے۔ اس وقت وہ ایک ذہین، الوالغرم، محنتی، فارغ التحصیل طالب علم تھے۔ ارادوں میں بلندی تھی۔ مذہب سے کبھی دلچسپی اور علم و فن سے سچا عشق تھا۔ ان کی نظم و نثر سے شعری اور ادیبانہ خوبیاں عیاں تھیں لیکن ان کمالات کا غلط استعمال ہو رہا تھا۔ ان کی شاعری عشقیہ غزلوں کے لئے وقف تھی اور مذہبی اور علمی جوش کا سارا اظہار غیر مقلدوں سے مناظرہ بازی میں ہوتا تھا۔ علی گڑھ جا کر یہ سب کچھ بدل گیا۔ عشقیہ شاعری کی جگہ قومی شاعری نے لے لی اور جو جوش طبیعت اور احساس مذہبی، فرقہ اہل حدیث کی ”تردید بلکہ تعذیب“ میں صرف ہو رہا تھا وہ غیر مسلکوں اور اسلام کے دشمنوں کے لئے وقف ہو گیا۔

لیکن قیام علی گڑھ سے فقط یہی نہیں ہوا کہ شبلی کی صلاحیتوں کے استعمال کا رخ بدل گیا اور وہ اس سراب سے بچ گئے جس میں ہمارے بڑے قابل اور پرجوش علما کی علمی زندگیاں تباہ ہوئی تھیں بلکہ جو علوم، یعنی تاریخ و سیر، شبلی کا طرہ امتیاز ہیں۔ وہ انھوں نے غازی پور میں حاصل کیا۔ یا لاہور یا سہارنپور نہیں، بلکہ پہلی مرتبہ علی گڑھ میں سیکھے! ^{موصوفہ}

اور سرسید نے شبلی کی علمی زندگی پر جو اثر چھوڑا وہ ان کے لئے مولانا
فیض الحسن سہارنپوری اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے اثر سے کم اہم
نہ تھا۔

آرنلڈ کی نسبت خود مولانا شبلی کا بیان ہے ص
آرنلڈ آں کہ رفیق است و ہم استاد مرا
مولانا حبیب الرحمن شروانی لکھتے ہیں :-

”بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اُس عہد میں پروفیسر آرنلڈ ایسا
علم دوست استاد کالج میں موجود تھا۔ یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے
اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نوز کی شغاعیں باہم مل کر عالم
کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے
آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم
علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں۔ علامہ شبلی کی صداقت اور توفیق
دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طعناق سے مرعوب نہیں ہوئے
بلکہ ان پر اطمینان سے غور کیا جو اصول عمدہ تھے۔ ان کو اخذ کیا
نہ صرف اخذ کیا بلکہ ان کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا۔..... علامہ شبلی نے
پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فزنج بھی سیکھی تھی.....

پروفیسر آرنلڈ سالہا سال محمدن کالج میں رہے۔..... وہ دوست شفیق
اور شفقت کے اثر سے شاگردوں کے دل میں گھر کرنے والے تھے اس پر
بھی ان کے کسی شاگرد نے ان سے وہ فیض حاصل نہیں کیا جو علامہ شبلی
کے حصہ میں آیا۔“

مولوی اقبال احمد سہیل بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی اس کی تائید میں

فرماتے ہیں :-

”مولانا شروانی کا یہ ارشاد یقیناً ”صحیح ہے کہ آزلٹ صاحب سے اور کسی شخص نے علی گڑھ میں اتنا فائدہ نہیں اٹھایا جس قدر علامہ موصوف نے اور ظاہر ہے۔ کہ اٹھا بھی نہ سکتے تھے کیونکہ اب تو مسلسل تجربات نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ انگریزی درسگاہوں میں نہ وہ قوتِ مطالعہ اور صلاحیتِ اخذِ پیدا ہوتی ہے۔ نہ اُستاد کی شخصیت سے وہ شغف اور شیفگی جو عربی مکاتیب کا مخصوص جوہر تھا۔“

شبلی اور آزلٹ کے درمیان بڑے خوشگوار علمی تعلقات تھے لیکن قیام علی گڑھ میں شبلی پر جتنا اثر سرسید کا ہوا کسی اور کا نہ تھا اور یہ تو یہ ہے کہ شبلی کی ذہنی اور علمی ساخت میں (ان کی طبعی صلاحیتوں کو چھوڑ کر) سب سے زیادہ ہاتھ دو شخصوں کا تھا۔ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کا اور سرسید کا۔ شبلی مولانا چریا کوٹی کے زیر اثر اس زمانے میں رہے۔ جب ذہنِ انسانی ایک لوحِ سادہ کی طرح اثر پذیر ہوتا ہے۔ اس لئے مولانا محمد فاروق کا اثر سب سے دیر پا ثابت ہوا۔ پھر ایک زمانے میں شبلی سرسید کے رنگ میں رنگ گئے۔ یہ رنگ اخیر عمر میں دھلنا شروع ہو گیا لیکن اگر عطیہِ فطرت کو نظر انداز کر دیں تو واقعہ یہ ہے کہ شبلی کو شبلی دو شخصوں نے بنایا۔ سرسید نے اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی نے !!

سید سلیمان ندوی، جن کے خیال میں شبلی کی بڑائی اسی میں ہے کہ اس کے محسنوں کو نیچا دکھایا جائے۔ حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں کہ اگر علی گڑھ نے شبلی کو شبلی بنا دیا تو کیا وجہ ہے کہ اس بزم میں آکر کسی اور کا قد و قامت نہیں بڑھا۔ فی الحقیقت سید صاحب کا طنزِ بجا نہیں کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے

ہیں شبلی علی گڑھ میں فقط جو ہر قابل ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ادراک خاص رنگ میں، تربیت یافتہ جو ہر لے کر آئے تھے لیکن کاش سید سلیمان یہ بھی بتائیں کہ شبلی کے علاوہ اور کون تھا جسے اتنی مدت تک اور اتنے قرب و یگانگت سے علی گڑھ کے پیر میکدہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا؟

شبلی قمریاً سو لہ سال تک علی گڑھ رہے۔ اس طویل مدت انھیں، اسلامی ہندوستان کی سب سے مقتدر، زندہ ہستی سے روزانہ صحبت اور اخذ فیض کے جو مواقع میسر آتے تھے۔ ان کا بیان شبلی کے ایک پرلے دوست کی زبانی سنئے۔ مولانا عبدالحلیم شرر شبلی کے ان وفادار دوستوں میں سے تھے جو ندوہ کی سورش میں بھی شبلی کے ہم خیال رہے۔ وہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

علی گڑھ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطہ کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی۔ ان میں جستجو و تحقیق کا سچا مذاق دیکھ کر سید صاحب نے ان سے ربط ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روزانہ بلا ناغہ مولانا اور سید صاحب میں گھنٹوں صحبت رہتی۔ اس زمانہ میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کے ٹھہرنے اور ان کے ذریعہ سے خود سید صاحب کا ہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ ہفتہ کھانا کھانے اور ترکیب صحبت رہنے کا موقع ملا۔

شبلی نے بھی ایک خط میں، جو علی گڑھ کی ملازمت کے سات ماہ بعد اس زمانے میں لکھا گیا۔ جب سرسید نے ابھی انھیں اپنے پاس نہیں بلایا تھا۔ سرسید کے کتب خانے کا ذکر کیا ہے :-

میں جس حالت میں ہوں۔ اچھا ہوں۔ سید صاحب نے اپنے کتب خانے

کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب مینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔ سید صاحب کے پاس تاریخ و جغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں۔ جن کو میں کیا، بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے۔ مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں۔ مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں۔ گنن صاحب کی تاریخ جس کا ترجمہ سید صاحب نے چھ سو روپیہ کے صرف سے کرایا ہے۔ میرے مطالعہ میں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب شبلی سرسید کے قریب آگئے تو انھوں نے اپنا کتب خانہ ہی انھیں سونپ دیا اور یہ سلسلہ سرسید کی موت تک قائم رہا مولوی امجد علی اشہری حیات انیس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

”۱۳۱۵ مطابق ۱۸۹۸ء میں جس سال مدرستہ العلوم علی گڑھ کے مشہور بانی سرسید احمد خاں کا انتقال ہوا۔ راقم کو نواب محسن الملک کی خدمت میں علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا جو سرسید کی کوٹھی میں فروکش تھے۔ اس کوٹھی کے عالیشان کمرے میں سرسید کا کتب خانہ علامہ شبلی صاحب کے سپرد تھا۔“

لیکن سرسید کے ہاں فقط شبلی کو وہ کتابیں ہی پڑھنے کو نہ ملیں جن کا شبلی نے ابھی تک نام نہ سنا تھا بلکہ سرسید نے شبلی کی اس علم میں راہنمائی کی جو آج ان کا تاجِ فضیلت ہے یعنی علم تاریخ و سیرت نگاری۔ سرسید کو تاریخ اور آثار اسلامی سے شروع سے غیر معمولی شغف تھا۔ ان کی آثار الصنادید قدیم مذاقِ تحریر کے وجود آج بھی مورخ کے لئے واقعات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اسلامی ہندوستان کی تین اہم تاریخی کتابیں آئین اکبری، توذکِ جاگیر اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی سرسید نے اشاعت کے لئے مرتب کیں۔ ان میں سے تیسری بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی نے چھپوائی اور باقی دونوں

۵۰
نے اپنے خرچ سے شائع کیں۔ اسلامی تاریخ سے یہ شغف تھا۔ جو شبلی نے
سرسید سے حاصل کیا۔ مولانا عبدالحکیم شرر جو شبلی اور سرسید کی ابتدائی
صحبتوں میں شریک ہوتے تھے شبلی کی شنوی صبح امید کا ذکر کر کے
لکھتے ہیں :-

”اب سید صاحب کی توجہ دلانے لئے وہ تاریخی تنقید و تحقیق میں مہرور

ملہ یہ تو ایک عینی شاہد کا بیان ہے لیکن سید سلیمان نے حیاتِ شبلی میں یہ سلسل کو شمش
کی ہے کہ شبلی پر سرسید کا جو اثر و فیض تھا۔ اس کے بارے سے اُسے اپنے کمالِ انتہا پر دازی
سے سبکدوش کر دیں شبلی کے تاریخی مذاق کی نسبت ان کا قیاس ہے کہ یہ ڈاکٹر لائونگ
کی سنینِ اسلام کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سلیمان صاحب کے پاس اس خیال
کی تائید میں ایک بھی شہادت نہیں۔ ان کا سارا اندراج قیاس پر مبنی ہے اور وہ بھی
قیاسِ بیجا پر۔ مثلاً سنینِ اسلام کی نسبت وہ لکھتے ہیں۔ ”غالبا مولانا کو یہ کتاب
ان کے لاہور ہی کے زمانہ قیام میں ہاتھ آئی تھی۔“ حالانکہ ان کے اپنے بیان کے مطابق
یہ کتاب ۱۸۶۶ء میں لکھی گئی۔ مکاتیبِ شبلی کے مطابق شبلی ۱۲۸۹ھ یعنی ۱۸۷۲ء میں
لاہور میں قیام پذیر تھے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں فالتو کتابوں کے لئے
شبلی کے پاس جو روپے کی فراوانی تھی۔ اس کا اندازہ بھی شبلی کے خطوط سے ہو سکتا
ہے (۲) اسی طرح سید سلیمان، سنینِ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ۱۸۸۳ء
میں مولانا نے جو فارسی عہدہ قصیدہ لکھا تھا۔ اس میں تاریخِ اسلام کے بعض ممتاز
شہروں اور نامور خاندانوں کے حوالے ہیں۔ لیکن اس کا ذرہ بھر ثبوت نہیں کہ
شبلی نے یہ حوالے سنینِ اسلام سے لئے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فارسی قصیدہ میں جتنے
غیر متعارف نام آتے ہیں سب سوسدس حالتی میں موجود ہیں اور جو اس میں نہیں۔
(باقی صفحہ آئندہ پر)

تھے جس کا سب سے پہلا نمونہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم پر ان کا لکچر تھا جسے انھوں نے محمد بن ابی کبشیشل کا نفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا۔

مولوی اقبال احمد سہیل بھی اس سلسلے میں لکھتے ہیں :-

دوسرا اور غالباً سب سے بڑا احسان علی گڑھ کا یہ تھا کہ مولانا کا موضوع تصنیف بدل گیا۔ اگر اسی قدیم ماحول میں رہے تو درسیات کے شروع و حواشی یا فروعیات فقہی کے تنگ دائرہ سے نکلتا شاید نصیب نہ ہوتا۔ یہاں آئے تو تاریخ اسلامی کے ناپید اکنا میدان میں تنگ و دو کا دولہ پیدا ہوا۔

شبلی کو قومی تاریخ سے روشناس کرنے، اس ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے اور ان سے قومی تاریخ پر کتنا ہیں لکھوانے کے علاوہ سرسید نے یہ کیا کہ شبلی کے موضوع شعر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

بہر حال علی گڑھ تحریک کے بعض اثرات کو انھوں نے بہت جلد قبول کر لیا ان کے وہ رنگین ترانے جو اب تک حسن عشق کی جھوٹی (؟) کہانیوں سے لبریز ہوتے تھے۔ اب قوم و ملت کے عشق سے خوں افشاں ہونے لگے۔ مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ یہ احساس اب ان کی قومی نظموں کا موضوع

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) وہ سنیں اسلام میں بھی نہیں (۳) کاش سلیمان صاحب، سلیمان کو ہی بہ نظر غور دیکھتے اور یہ فیصلہ کرتے کہ کیا اس ناموں کی کھنونی اور بخاندانوں کی ہمت سے ایک نئے علم کا شوق پیدا ہو سکتا ہے؟

بن گیا۔

شبلی پر کالج اور سرسید کے جو علمی احسانات تھے۔ انھیں شبلی نے ۱۸۹۴ء کی ایک تقریر میں تفصیل سے بیان کیا تھا۔ فرماتے ہیں :-

”حضرات ایسے ہیں کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پاسکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی نشوونما، اس کی ترقی، اس کی نمود، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے۔ اس کالج سے ہوا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرہ میں قلم نہیں رکھا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور شائع ہو چکی تھیں لیکن ان کا کیا مقصد تھا۔ آپ کے بھی جھکڑے [بڑھانا]۔ مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا اس کو قوت اور استحکام دینا!

میں آج سے بہت پہلے فارسی شعر بھی کہتا تھا لیکن وہ کس قسم اور کس درجہ کے تھے؟ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی موجودہ شاعری کو اعلیٰ رتبہ کی خیال کرتا ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آج کی میری شاعری اگر سیت ہے تو اس وقت پست تر تھی۔ غرض یہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے۔ وہ اسی کالج کی بدولت ہے۔ اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج کا پروفیسر ہوں۔ اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں! ...

آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ یہ کالج صرف طالب علموں اور اسٹوڈنٹس کو

۱۔ یہ تقریر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپی تھی۔ ہم نے اس کا اقتباس مولوی محمد امجد علی کے ایک مضمون سے نقل کیا ہے۔

علمی ترقی دلاتا ہے بلکہ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کی علمی اور روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہ طالب علموں کو بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتا ہے تو وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کو شمس العلماء کہہ سکتا ہے۔
اس کے بعد ان اہل کمال (مثلاً سید محمود۔ حالی۔ نواب محسن الملک) کا ذکر کر کے جو کالج کے احاطہ میں موجود تھے۔ مولانا شبلی نے (سرسید کے متعلق) فرمایا:۔

”حضرات میں نے بزرگوں کی جو فہرست پیش کی ہے۔ اس میں ایک نام اور سب سے بڑا نام دانستہ بھولا ہوں کیونکہ میرے نزدیک جب اس کالج کا یا کالج کے متعلق جس چیز یا جس شخص کا نام لیا جائے۔ اس میں اسی بڑے شخص کا جلوہ موجود ہے۔“

جدھر دیکھتا ہوں، اُدھر تو ہی تو ہے!“

لیکن سرسید نے فقط شبلی کی علم و ادب کے نئے کوچوں میں راہنمائی نہیں کی وہ ان کے سچے محب اور پر جوش معاون تھے۔ شبلی اور سرسید کے ابتدائی خطوط سے خیال آتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان وہی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ جو ایک شفیق باپ اور ایک ہونہار بیٹے میں ہوتا ہے۔ شبلی کی عمر اس وقت پچیس سال تھی اور سرسید کی ساٹھ سے بھی زیادہ۔ عمر میں وہ شاگرد شبلی کے والد سے بھی بڑے تھے۔ اس کے علاوہ سرسید کو تو قوم کا ہر قابل فرد عزیز تھا۔ انھیں خاص علی گڑھ کالج کا ایک جوہر قابل کیوں نہ عزیز ہوتا۔ چنانچہ انھوں نے اس نوجوان و نوجوان سے وہی سلوک کیا جو ایک شفیق باپ ایک عزیز بیٹے سے کرتا ہے۔ شروع میں شبلی شہر میں رہتے تھے اور ان کی تنخواہ کا بڑا حصہ سواری میں اٹھ جاتا تھا۔ سرسید نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطے میں

مکان دیا۔ ایک دفت کے کھانے پر وہ عام طور شریک ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ سرسید ان کی صحت، ان کی ناموری اور ان کے مفاد کا پورا خیال رکھتے تھے۔ وہ ۱۸۸۷ء میں بہت علیل ہوئے تو سرسید کے بیٹے سید حامد نے، جو ان دنوں ہلی میں مامور تھے۔ تحریک کی کہ وہ دہلی آئیں اور وہاں ممتاز اطباء سے علاج کرائیں۔ پھر سرسید انھیں اپنے ہمراہ بنی تال لے گئے۔ ۱۸۸۹ء میں انھوں نے دوسری جگہوں کے علاوہ نواب عماد الملک کو شبلی کا گزشتہ تعلیم پر کچھ بھیجا اور ساتھ ہی خانگی خط میل س کی تعریف کی۔ جب عماد الملک نے اس کے جواب میں ایک تعریفی فقرہ لکھا تو شبلی کو نواب صاحب سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی [شاید یہ خیال ہو کہ حیدرآباد سے نواب صاحب کو وساطت سے اس طرح کا تصنیفی وظیفہ مل جائے۔ جو ۱۸۸۸ء میں مولانا حالی کو بصیغہ امداد مصنفین مل چکا تھا اور جس طرح حالی نے اس وظیفہ کے بعد ترک ملازمت کر کے اپنے تئیں ہمہ تن علمی ادبی کاموں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہ بھی کہہ سکیں] آچانچہ سرسید ۱۸۹۱ء میں شبلی کو اپنے ساتھ حیدرآباد محض اس لئے لے گئے کہ انھیں عماد الملک سے ملائیں اور اس طرح شبلی کے نواب عماد الملک اور ان کے بھائی سید علی بلگرامی سے ان تعلقات کا آغاز ہو جن کی بدولت، چار پانچ سال بعد شبلی کو سید علی بلگرامی کے صبیحہ سے سو روپیہ کا تصنیفی وظیفہ حاصل ہوا اور علی گڑھ چھوڑنے کے بعد حیدرآباد میں معقول ملازمت ملی۔

لے سرسید نواب عماد الملک کو لکھتے ہیں ”اگر ممکن ہو تو مولوی شبلی صاحب کو بھیجیے لاؤں گا تاکہ آپ کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں کہ آپ کون ہیں اور کیسے ہیں“

اس کے علاوہ ۸۹۲ھ میں سرسید نے خاص چٹھی لکھ کر گورنمنٹ میں سفارش کی کہ مولانا شبلی کو شمس العلماء کا خطاب دیا جائے۔ چنانچہ اس تحریر سنیتیس سال کی عمر میں مولانا کو یہ خطاب عطا ہوا۔

مولانا بھی ان احسانات اور علی گڑھ تحریک کے نیک اثرات کے دل سے قائل تھے اور اس تحریک میں دل و جان سے شریک ہوئے۔ ان کے پاس دینے کو بہت دھن نہ تھا لیکن انھوں نے زبان اور قلم سے کالج کی بڑی خدمت کی۔ ان کے بعض کام تو ایسے تھے جو ایک دارے کے ملازم کو لوازم ملازمت سمجھ کر کرے پڑتے ہیں۔ (مثلاً علی گڑھ یونین میں ان کی تقریریں یا علی گڑھ میگزین کی ادارت)۔ لیکن انھوں نے بہت سے دوسرے کام اپنے شوق سے ہاتھ میں لئے اور کالج کی عزت اور شہرت کا سبب بنے۔ سرسید کے تو وہ ادبی معاون تھے اور قرین قیاس ہے کہ ان کی تفسیر میں جس پران کی توجہ ان دنوں مبذول تھی۔ شبلی نے ان کا ہاتھ بٹایا ہوگا۔ اس زمانے کی

لے مولانا اقبال احمد پہلی سیرت شبلی میں لکھتے ہیں۔ ”سرسید نے اپنی تفسیر میں جو حد طرازیوں کی ہیں وہ خود ان کے دل و دماغ کی پیداوار نہ تھیں بلکہ ان کا بیشتر حصہ مولانا فاروق کے بڑے بھائی مولانا عنایت اللہ رسول چریا کوئی مرحوم کے خرم کمال سے مستعار تھا۔“ مولانا عنایت رسول سے سرسید نے جن دو ایک مباحث میں میڈلی تھی۔ اس کا انھوں نے بالوضاحت ذکر دیا ہے لیکن چونکہ شبلی اور سرسید کا تالیف کے دوران میں دن رات کا ساتھ تھا اور شبلی کے عقائد بھی (جیسا کہ ان کی بعد کی تصانیف مثلاً الکلام۔ علم الکلام سے صاف نظر آتا ہے)۔ سرسید سے ملتے جلتے تھے۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ تفسیر کی تالیف کے دوران میں اکثر دونوں میں تفسیری مباحث (باقی صفحہ آئندہ پر)

اکثر تصنیفیں شبلی نے کالج کو ہیہ کر دیں اور ان کی مالی انتاعت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

شبلی فارسی اور عربی کے پروفیسر تھے لیکن سرسید نے کلام مجید کا درس ان کے سپرد کر رکھا تھا اور انھوں نے کالج میں ایک مذہبی فضا قائم کرنے میں سرسید اور سید محمود اور کالج کے نیک خیال طلباء کی بڑی مدد کی۔ ان کا سالہ ۱۸۸۶ء کا ایک خط پڑھئے :-

”اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھیے نہ کوئی اور واقعہ۔ آپ سُنئے اور میں دل سے اُٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سُناؤں۔ یوں تو مدرستہ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو لجنة الصلوة کہتے ہیں۔ ایک بی۔ اے سکریٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خوان لوگوں کو اس پُر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے۔ الصلوة خیر من النوم۔ پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے۔ بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔

مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان و شوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چونکہ وہ عال باحدیث ہیں۔ آئین زور سے کہتے ہیں۔ ان کی آئین کی گونج مذہبی جوش کی

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) گفتگو ہوتی ہوگی اور اگر سرسید کی تفسیر میں مصنف کے سوا کسی اور کا ہاتھ ہے تو وہ مولانا فاروق کے بھائی کا نہیں بلکہ ان کے جانِ استاد شاگرد شبلی کا ہے۔

رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں مسجد بننے کی تیاری ہے۔ سید محمود صاحب کی سرگرمی نے اس کے پیمانہ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے۔ وہ ہتھم خاص ہیں اور تین ہزار چندہ خود دیں گے۔ میں نے بھی حصہ دے ہیں۔ سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاوڑا لیں گے اور مسجد کی بنیاد کھودیں گے۔ لاگت کا تخمینہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ ہے۔ مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوشِ مذہبی کا برا لکھنے کر نامیری قسمت میں بھی تھا۔

اس جوشِ مسرت میں اور بھی لکھنا مگر مجھ کو میرے بھائی خصوصاً میاں اسحاق و عثمان یاد آگئے اور میرا سارا جوش اس طرح ٹھنڈا ہو گیا جس طرح طاؤس کا اپنے پاؤں دیکھنے سے۔

ان عزیزوں نے ترقی و لیاقت کا طرہ فخر صرف لاندہ ہی کو سمجھا ہے۔ حالانکہ لیاقت بھی کچھ دنیا سے نرالی نہیں۔ خیر خدا توفیق دے۔“
 علی گڑھ کالج سے شبلی نعمی محبت اور سرسید سے ان کی عقیدت کا سب سے با اثر اظہارِ مشنوی صبحِ امید میں ہوا ہے جو شعراء میں شائع ہوئی اور فنی نقطہ نظر سے اردو کی بہترین طویل نظموں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اس کی نسبت جدید اردو شاعری کے مصنف نے بالکل بجا کہل ہے کہ ”اس میں سرسید احمد خاں کا جیسا پاکیزہ کردار شبلی نے اشاروں اشاروں میں کھینچ دیا ہے وہ حالی کی حیاتِ جاوید سے کبھی نہ ہو سکا۔“ اس نظم میں شاعر نے ”پیرِ دیریں“ (سرسید) کی چار شعروں میں ایک نہایت دل نشین تصویر کھینچی ہے اور اس کے بعد قوم نے سرسید کی جو قدر کی اور سرسید

س کا جو جواب دیا۔ اس کا بیان ہے۔

کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں
 نا کام رہا صدائیں دے کر! دشنام سنی دعائیں دے کر!
 حنظل پائے شکر کے بدلے! سنگ اس کو ملے گہر کے بدلے!
 لعل اس نے دے شرار پائے! گل نذر کے تو خاں پائے!
 کیا تلخ ملے جواب اس کو! کیا کیا نہ دے خطاب اس کو!
 برگشتہ کہا کسی نے دیں سے! لعنت کا صلا ملا کہیں سے!
 خود قوم کو ہو گئی تھی یہ کد زندیق کہا۔ کسی نے مُرد! وہ اپنی ہی دھن میں نکھا کر غرق
 چرے تھے یہی زغرب تا شرق وہ شفیقہ پھر بھی سر بھفت تھا
 گونا وکِ ظلم کا ہدف تھا ذلت پہ بھی اپنی تھا اسے ناز
 منظور جو قوم کا تھا اعزاز وہ درد کو بھی دوا ہی سمجھا
 دشنام کو وہ دُعا ہی سمجھا! لطف اس نے کئے ستم کے بدلے!
 جو اس نے سہے کرم کے بدلے! سرسید کی کوششوں سے قوم میں جو ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔

کا بیان بھی بڑا پُر اثر ہے۔

باتوں میں اثر تھا کس بلا کا اک بار جو رخ پھرا ہوا کا
 اُمید کی بڑھ گئی تنگ و تناز اور سچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
 خواہش کے بدل گئے ارادے ہمت نے قدم بڑھائے آگے
 وہ دوڑ چلے جو پابگل تھے آندھی ہوئے جو فرہ دل تھے
 جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا مخور بھی اب تو ہوش میں تھا
 اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے اخبار کہیں۔ کہیں رسالے

تعلیم کے جا بجا وہ جلسے گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
 بیتاب ہر ایک جزو کل تھا ہر بار ”بڑھے چلو“ کا غل تھا
 اس کے علاوہ ان کی وہ نظمیں قابل ذکر ہیں جو انھوں نے مشہور
 ہستیوں کی آمد پر کالج کے جلسوں میں پڑھیں اور جن میں معزز مہانوں کی
 تعریف کے علاوہ کالج اور علی گڑھ تحریک کا بیان ہے۔ شبلی بڑے حساس
 اور خوددار انسان تھے بلکہ بعض اوقات تو ان کا غر نفس کا شدید احساس
 اس طرح بڑھ جاتا کہ وہ خودداری (SELF RESPECT) اور زود حسی
 (SENSITIVENESS) میں تمیز نہ کر سکتے۔ انھیں دوسروں کی ملح سخت
 ناپسند تھی۔ اس لئے انھوں نے ان مدنیہ نظموں اور قصیدوں کو اپنے دیوا
 میں جگہ نہیں دی لیکن سید سلیمان ندوی نے بعض قصائد کو اپنی کتاب کے
 حاشیے پر نقل کیا ہے۔ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں کالج
 پر شبلی کو کس قدر ناز تھا اور ان کا جوش و ولولہ کس طرح اشعار میں اُبلا
 پڑتا تھا!

۱۸۹۵ء میں انھوں نے نواب وقار الامرا کی آمد پر ایک قصیدہ پڑھا
 تھا۔ اس کے چند اشعار ہیں:-

صاحبِ اگوش بہنِ دایر کہ تاشیح دہم
 بود روزے کہ گراں پایگی رتبہ ما
 حالبا کارباں سے سرو پای بجشید
 بگذرد از غم و آزار پیایے برما
 ہر چہ از بسکسی و ذلت و خواری بینی
 گر نہ این مکتبِ اس مدرسہ بیامی گشت
 اُنچہ برما ز سببِ کاری دُوراں گزرد
 بیش از ازاں بود کہ در ہم سخنداں گزرد
 کہ بہا ہر کہ رسد بر زدہ داماں گزرد
 اُنچہ بر شیشہ افادین سنداں گزرد
 خود عیان است دہر آن کہ یہنیاں گزرد
 بیم آں بود کہ ایں در و ز درماں گزرد

ابن مسیحانہ اگر بہر مد اوامی خاست

بیم آں بود کہ رنجور خود از جاں گذرد

ان نظموں، دوسری تصانیف اور علی گڑھ کی ملازمت کی وجہ سے شبلی کاشمار سرسید کی فوج کے نامی پہلوؤں میں سے ہونے لگا اور بعض لوگ انھیں اب بھی اسی حیثیت سے دیکھتے ہیں لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا۔ جب شبلی نے علی گڑھ اور سرسید کی پالیسی کے خلاف ایک محاذ قائم کیا اور اُس ردِ عمل کو مستحکم کیا جو علی گڑھ تحریک کے خلاف اسلامی ہندوستان میں جاری ہوا۔

بظاہر تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن اگر شبلی کی ابتدائی نشوونما اور ان کی طبیعت کا دھیان رکھیں تو اس قدر غیر متوقع نہیں۔ شبلی کی تمام تعلیم قدیم اسلوب کے ماتحت ہوئی تھی۔ ان کے اساتذہ میں سے جس شخص نے سب سے زیادہ ان پر اپنی شخصیت کا نقش یادگار چھوڑا مولانا محمد فاروق چریا کوئی تھے۔ جو بقول مولوی اقبال احمد سہیل ”تحریک جدید کے بڑے مخالفوں میں سے تھے“ شبلی کے باقی سب بھائیوں نے کالجوں میں تعلیم پائی اور وہ اپنے گھر میں جدید کے خلاف قدیم کے ترجمان تھے۔ جب انھیں انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے معمولی ملازمتیں بھی نہ ملیں تو انگریزی تعلیم کے خلاف غم و غصہ اور بڑھ گیا۔ ہم ان کا وہ فارسی خط نقل کر چکے ہیں جس میں انھوں نے جل کر عزیزوں کے انگریزی خوانی کے مشورے کو غیر ضروری قرار دیا اور وہ بیچ کے مضامین اور اکبر کی نظموں نے ان کے خیالات کو اور مضبوط کر دیا چنانچہ جب وہ علی گڑھ کالج میں آئے تو اگرچہ وہ سرسید کے مدد خواں اور ان کی فوجی بھی خواہی کے قدر رواں تھے لیکن وہ انگریزی اور جدید تعلیم سے

بھی متفکر تھے۔ جس سال وہ علی گڑھ آئے ہیں۔ اسی سال کا ایک خط ہے:-

”یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو۔ خیالات کی وسعت سچی آزاد بلند مہمتی۔ ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی۔ اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے۔ لا حول ولا... وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے۔ سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے۔ صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے

ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔ اس خط میں شبلی نے انگریزی خوانوں کی جو شکایت کی ہے وہ یہی ہے۔ لیکن پہلا فقرہ بھی غور طلب ہے۔ ”یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے“ یعنی یہ خیالات یہاں آکر پیدا نہیں ہوئے۔ انھیں شبلی اپنے ساتھ ہی لائے تھے لیکن یہاں پہنچ کر وہ اور مضبوط ہو گئے!!

اس کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی ہوئی۔ علی گڑھ کے قیام کے بعد ان کی یہ رائے ہو گئی کہ قدیم مدارس میں فقہ۔ منطق۔ صرف و نحو کے ساتھ ساتھ انگریزی کو بھی شامل کیا جائے لیکن اس سے مقصود قدیم کو جدید بنانا نہ تھا بلکہ فقط قدیم کو مضبوط کرنا تھا۔ شبلی کو دلی اُلفت قدیم کے ساتھ تھی اور جب کبھی انھیں مشرقی علوم یا قدیم طریقہ تعلیم پر فخر کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ خوشی سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ ۱۸۶۷ء میں اٹلی میں مستشرقین کی کانفرنس

گورنمنٹ نے مولوی سمیع اللہ خاں کے بیٹے مولوی حمید اللہ خاں کو وہاں بھیجے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے یہ کہہ کر کہ وہ مجلس مذکور کے لئے کوئی مضمون نہیں لکھ سکتے۔ سرسید کو لکھا کہ وہ علی گڑھ کے علماء سے کچھ لکھ آئیں۔ اس پر شبلی اپنے چچا کو لکھتے ہیں :-

”آپ دیکھیں کہ عربیت اب بھی موجبِ شہرت و عزت ہے۔ اگر آج حمید اللہ خاں عربی سے واقف ہوتے تو نہ صرف لندن بلکہ تمام یورپ میں ان کی ناموری کا پھر یہ اڑتا۔“

اس کے علاوہ حالات کچھ ایسے تھے کہ کالج میں شبلی کا قدیم سے گہرا لگاؤ ناگزیر تھا۔ وہ کالج میں قدیم علوم اور السنۂ شرقیہ کے استاد تھے اور ان علوم کے اساتذہ کے ساتھ انگریزی کالجوں میں عام طور پر وہی سلوک ہوتا ہے جو ایک سوئٹلی ماں سوکن کی اولاد کے ساتھ کرتی ہے۔ ان کی تنخواہیں انگریزی اور جدید علوم مثلاً سائنس کے اساتذہ سے قلیل ہوتی ہیں اور قدر و مرتبہ بھی اسی تناسب سے۔ اس صورتِ حالات کے لئے خواہ کون سے اقتصادی اسباب بتائے جائیں [اور ہم تو ان سب کے باوجود اس صورتِ حالات کو تعلیمی اور قومی نقطہ نظر سے سخت مفسر سمجھتے ہیں] لیکن اس کا یہ نتیجہ تو لازمی ہے کہ قدیم علوم کے اساتذہ کے لئے نظر کی پھانس کا بڑا سامان ہوتا رہے۔ اور اگر ان سے کوئی غیر معمولی طور پر حماس ہو تو اس کے لئے زندگی دو بھر ہو جائے شبلی کی حالت السنۂ شرقیہ کے عام اساتذہ سے کہیں بہتر تھی۔ وہ سرسید کے رفیق کار تھے اور سرسید ان کا بڑا پاس کر تھے لیکن شبلی ٹھاکریتوراج سنگھ کی نسل سے تھے۔ ان کی ذکاوت جس حد سے زیادہ برسی ہوئی تھی اور وہ خیالی یا حقیقی نہ ہوتی سے بہت جلد برم ہو جاتے سید سلیمان نے ان کی زور دہی کا ایک واقعہ اس زمانے کا نقل کیا ہے جب وہ کالج میں بھی بالکل نئے نئے آئے تھے۔

اور نہایت قلیل تنخواہ پاتے تھے۔ اس زمانے میں کالج میں کوئی تقریب تھی۔ جس میں سب اساتذہ شریک تھے۔ تعلیمی اداروں میں ہر استاد اپنے شعبے کو بانی سب سے اہم سمجھتا ہے۔ اس لئے ایسے موقعوں پر عموماً تنخواہ کے لحاظ سے کرسیاں بچھائی جاتی ہیں۔ اس موقع پر کبھی یہی ہوا اور چونکہ شبلی تنخواہ میں سب سے نیچے تھے۔ ان کی کرسی بھی سب سے پیچھے آئی۔ شبلی پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ بیٹھے کو تو بیٹھ گئے مگر آنکھوں میں آنسو بھر آئے!

ایک اس قدر زود جس انسان کے لئے کالج کا قیام جس آرام و آسائش کا سبب ہو سکتا ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ اس کے علاوہ بد قسمتی سے شبلی طلباء میں بھی خاص طور پر ہر دلعزیز نہ تھے۔ خواجہ غلام الثقلین لکھتے ہیں :-

علی گڑھ کے طلباء میں مولانا شبلی عموماً غیر ہر دلعزیز تھے۔ ان کو طلباء خشک اور مغرور سمجھتے تھے..... اُن کے ملنے والوں کا دائرہ بہت محدود رہتا تھا۔

ان حالات نے انھیں اور بھی زود رنج اور ذکی الہس بنا دیا تھا اور اب یہ حالت تھی کہ اگر نئے تعلیم یافتہ خیر خواہی سے بھی پُرانی تعلیم کی نسبت کچھ کہتے۔ تو شبلی اسے استہزا اور شتمات سمجھتے۔ وہ سفرنامہ روم و مصر و شام میں لکھتے ہیں :-

ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پُرانی تعلیم پر جو رنج و افسوس ظاہر کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا اور شتمات ہے۔

اس کے علاوہ جب وہ سرسید اور سید محمود سے طریق تعلیم کی نسبت بحثیں کرتے تو قدیم تعلیم کی نسبت ان کے خیالات اور زیادہ مضحکہ منگواتے۔ سرسید اسلامی ہندوستان میں جدید تعلیم کے بانی تھے۔ لیکن جدید تعلیم مقصود بالذات نہ تھی۔ اس کا مقصد قومی تنزل کو روکنا تھا اور جب کبھی سرسید کو جدید تعلیم

کے نتائج سے مایوسی ہوتی تو وہ ایک صاف دل انسان کی طرح اس کے اظہار سے گریز نہ کرتے۔ شبلی کے ایک نہایت ابتدائی خط میں سرسید کی اس مایوسی کا ذکر ہے۔ جو انھوں نے خود شبلی سے انگریزی تعلیم کے نتائج کے متعلق ظاہر کی۔ بعد میں یہ احساس اور بڑھنا گیا اور سرسید نے کبھی جگہ اس کا اظہار کیا۔ مثلاً نواب وقار الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی امید ہے وہ شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔

اسی طرح سید محمود کا حال تھا۔ شبلی ان کی نسبت لکھتے ہیں :-
یہاں میں نے مجلسِ مباحثہ میں اس بات پر لکچر دیا کہ ہمارا اگر ششہ طرزِ تعلیم موجودہ طرزِ تعلیم سے عمدہ تھا اور لطف یہ کہ عموماً طلبانے میرا سا بخود دیا اور..... سید محمود بالکل مجھ سے موافق تھے۔

رفتہ رفتہ شبلی کو خیال ہونے لگا کہ مسئلہ تعلیم کا حل یہ ہے کہ جدید اور قدیم کو ملا کر ایک معجون مرکب پیش کیا جائے۔ اس دوران میں انھیں ترکی۔ شام اور مصر کے سفر کا موقع پیش آیا۔ بظاہر تو یہ سفروہاں کے کتب خانوں کی سیر اور الفاروق کے لئے مواد کی تلاش کی غرض سے تھا۔ لیکن اس کا ایک بڑا مقصد ان ممالک کے طریقہ تعلیم کا مطالعہ تھا۔ اس میں شبلی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ شام و روم و مصر کے سارے اہم مدارس دیکھنے کے بعد دل پر جواثر ہوا۔ اس کا بیان ان کی اپنی زبان سے سُنئے :-

اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا۔ وہ اسی قدیم تعلیم کی اتنی تھی..... ہندوستان میں تو اس خیال سے صبر آجاتا تھا کہ جو چیز گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں نہ ہو۔ اس کی بے سرو سامانی مستدرق بات ہے لیکن قسطنطنیہ۔ شام اور مصر میں یہ حالت دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا۔

دنیائے اسلام کے سب سے اہم مدرسے جامع الازہر کی نسبت وہ لکھتے ہیں:-
مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامع الازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بخیر
کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا۔

بلاد اسلامی کے سفر سے مولانا اس درجہ مایوس ہو کر آئے کہ قدیم تعلیم کی اصلاح
کے جو منصوبے ان کے دماغ میں تھے وہ پس پشت پڑ گئے اور مسلمانوں
کی ترقی و قوت کی نسبت ان کی جو امیدیں تھیں برباد ہو گئیں "لیکن ان کی
واپسی کے ایک دو سال بعد ۱۸۹۳ء کے اخیر میں، لکھنؤ میں ندوۃ العلماء
کی تحریک اٹھی اور بقول سید سلیمان "اس دور سے اٹھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ
ہندوستان میں مولویوں کی حکومت قائم ہو جائے گی"۔ علما میں سے مولانا شبیر احمد
گنگوہی اس تحریک سے بالکل بے تعلق رہے اور انھوں نے شروع سے
کہہ دیا کہ مجھے ندوہ کا انجام اچھا نظر نہیں آتا اور مولوی محمد علی ناظم ندوہ
کو جو انھیں بلانے کے لئے گنگوہ آئے والے تھے۔ صاف لکھ دیا کہ وہ اس
مقصد کے لئے آنے کی تکلیف نہ کریں لیکن بہت سے علما اور ارباب علی گڑھ
نے اس کا خیر مقدم کیا۔ سرسید نواب محسن الملک اور وقار الملک نے اس
کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا لیکن ندوہ کی صدا پر لبیک کہنے والوں میں
سب سے آگے مولانا شبلی تھے۔ انھیں اس میں اپنی دیرینہ آرزو یعنی قدیم
تعلیم کی اصلاح و تنظیم کی تکمیل ہوتی نظر آئی بلکہ آرزوؤں کا یہ متوالا جس کی
ہمت کو "شروع سے ایک نشیمن بلند کی تلاش تھی"۔ یہ خواب دیکھنے لگا کہ
علما کو متحد کر کے اور ان کا "سرتاج اور شیخ الکمل" بن کر وہ ہندوستانی

مسلمانوں کے دل و دماغ کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکے گا۔

نمدہ کے آغاز نے شبلی کے مضمحل ارادوں میں پھر جان پیدا کر دی وہ ابھی غریب
تھے کہ کانج چھوڑ کر نمدہ میں شہر یک ہوں یا نہ کہ کانج کو دو ایک ایسے دھکے لگے جن
سے ان کا فیصلہ نسبتاً آسان ہو گیا۔ ۱۸۹۶ء میں کانج کے حساب میں شام بہاری
لال خزانچی نے کوئی ایک لاکھ روپیہ غنیمت کر لیا۔ اس سے کانج کی مالی حالت بالکل
تباہ ہو گئی جو کچھ کانج کے پاس بن تھا وہ غنیمت ہو گیا اور آگے کو چند سے کی راہ سدود
ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ کانج کی تعمیر بند ہو گئی مسئلہ کی تخرابیت قرض ہو گئیں اور لوگوں
میں یہ خیال عام ہو گیا کہ کانج کا اب باقی رہنا مشکل ہے !

علامہ شبلی اس زمانے میں کانج چھوڑنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ لیکن
ابتدائی زندگی کی کشمکش اور نامساعد حالات نے انہیں بڑا محتاط بنا رہا
تھا۔ کانج سے تعلق دوامی طور پر منقطع کرنے سے پہلے وہ چاہتے تھے کہ ان
کی کفالت کا کوئی انتظام ہو جائے اور وہ تجربہ کر کے یہ بھی دیکھ لیں کہ
علی گڑھ سے باہر کوئی حسبِ منشا کام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ انھوں
نے اخیر ۱۸۹۶ء میں کانج سے ایک سال کی رخصت لی اور تصنیفی و تالیفی
کے لئے تردد شروع کیا۔ اس وقت ریاست کے مدارالہام نواب
وقارالامرا تھے۔ جن کی تعریف میں مولانا ۱۸۹۵ء میں ایک زبردست
تصیہ پڑھ چکے تھے اور ان سے علی گڑھ میں ہی اچھی طرح روشناس
ہو گئے تھے۔ دوسرے نواب صاحب کے ہاں مولوی سید علی بلگرامی کا
جن سے مولانا کے تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ خاص رسوخ تھا۔ ان
دونوں کی مدد سے سو روپے کا ماہوار وظیفہ شبلی کے نام جاری ہوا اور
شرط یہ قرار پائی کہ آئندہ سے مولانا کی تمام تصنیفات سلسلہ آصفیہ میں

شامل ہوں۔

حیدرآباد کے تصنیفی وظیفے سے مولانا کے لئے روزگار کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن انھوں نے تجربے کے طور پر جو رخصت لی تھی۔ اس کا نتیجہ خوشگوار نہ ہوا۔ وہ رخصت لے کر اعظم گڑھ چلے گئے لیکن یہاں ان کا دل نہ لگا اور وہ ایک سال کے بعد نومبر ۱۹۷۱ء میں کالج میں واپس آ گئے۔ وہ اسی زمانے کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

باقی ترکِ تعلق، اس کی یہ کیفیت ہے کہ میں نے سال بھر کی رخصت اسی تجربہ کے لئے لی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اعظم گڑھ سال بھر نہیں رہ سکتا۔ وہاں کوئی ایسی دلچسپی نہیں کہ سارا سال کام چل سکے۔ اس لئے کچھ یہاں (ملیکوٹ) کچھ وہاں (اعظم گڑھ) کچھ ندوہ، اس طرح بسر کرنے کا ارادہ ہے۔

ایک سال کی دشتِ نوردی میں شبلی نے اندازہ کرایا کہ کالج کے قطعی ترکِ تعلق ان کے لئے مفید نہیں۔ چنانچہ وہ علی گڑھ واپس آئے اور سرسید کے کاموں میں بُرائی سرگرمی سے شریک ہو گئے۔ اس وقت سرسید اور ان کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے اور دونوں کے درمیان پورا اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل تھا۔ سرسید ان دنوں ترکی اور یونان کی لڑائی اور اس کے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کے شدید جذبہ باقی تاثرات سے سخت متاثر تھے۔ انھیں یہ نظر آ رہا تھا کہ ہندوستانی مسلمان اپنی موجودہ حالت میں اس قابل تو نہیں کہ ترکی یا کسی اسلامی ملک کی کوئی عملی مدد کر سکیں لیکن اکثر انگریزوں کی ہمدردی یونان کے ساتھ تھی اس لئے انھیں ڈر تھا کہ کہیں ترکی کی جذبہ باقی اور بے نتیجہ محبت کی خاطر ہندوستانی مسلمانوں اور انگریزی حکومت کے درمیان سے وہ یک جہتی نہ اٹھ جائے جسے انھوں نے بڑی مشکلات کے بعد پیدا کیا تھا اور جو ان کے خیال میں ہندوستان کے

خاص حالات کے لحاظ سے قوم کے لئے ضروری تھی چنانچہ انھوں نے تین چار ایسے مضامین لکھے جن میں ترکوں سے اسلامی ہندوستان کی محبت کا پورا اظہار کیا۔ مسٹر گلیڈ اسٹون اور دوسرے انگریزوں کی سخت مذمت کی لیکن یہ صاف لکھ دیا کہ ترکی سے ہندوستانی مسلمانوں کو اس لئے محبت ہے کہ وہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے اس لئے نہیں کہ وہ سلطان روم کو خلیفۃ المسلمین سمجھتے ہیں اور مذہبی معاملات میں اس کے احکام کے پابند ہیں۔ شبلی نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور ایک مدلل مضمون میں سرسید کی تائید کرتے ہوئے 'تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں (مثلاً مغل بادشاہوں) نے کبھی بھی عثمانی ترکوں کی خلافت تسلیم نہیں کی۔

سرسید بھی شبلی کی دلی خواہشات کی تکمیل میں ان کے ساتھ تھے۔ شبلی کی یہ تجویز کہ وہ سال میں چند مہینے علی گڑھ کی ملازمت کریں اور باقی وقت ندوہ اور اعظم گڑھ میں گزاریں ایک ایسی خواہش تھی جس کی ہر تعلیمی ادارے کے منتظمین مخالفت کریں گے لیکن سرسید اس کے حق میں تھے وہ چاہتے تھے کہ شبلی کے قیام سے کالج کو بھی فائدہ پہنچتا رہے اور ان کے تصنیفی کاموں میں بھی ہرج نہ ہو چنانچہ وہ اس بات پر راضی تھے کہ شبلی سال میں چھ ماہ کالج میں قیام کریں اور چھ ماہ کی انھیں رخصت دی جائے لیکن سید محمود جن کا کالج میں بڑا عمل دخل تھا اور جن کی طبیعت اس وقت بہت بگڑ چکی تھی شبلی کے سخت مخالف ہو گئے۔ انھوں نے اس تجویز کی بھی مخالفت کی اور شبلی کے خلاف بھی بہت باتیں کہیں۔

شبلی اس وقت بڑی کشمکش میں تھے۔ وہ کالج میں فقط اس شرط پر رہنے

کو آمادہ تھے کہ انھیں تصنیف و تالیف کے لئے فراغت میسر ہو اور علی گڑھ باہر رہنے کا موقع ملے۔ سرسید اس کے لئے سہولتیں پہنچانے کو تیار تھے لیکن سید محمود جو اس وقت جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس کے خلاف تھے۔ ابھی یہ سوال حل نہ ہوا تھا کہ قضا و قدر نے شبلی کا راستہ صاف کر دیا۔ ۲۷ مارچ ۱۸۹۷ء کو سرسید نے وفات پائی اور ان کی جگہ قاعدے کی رُو سے سید محمود کالج کے سکریٹری ہو گئے۔ چنانچہ مئی ۱۸۹۷ء سے شبلی نے پہلے چھ مہینے کی رخصت لی۔ اور پھر استغفہ بھیج کر علی گڑھ سے علیحدہ ہو گئے۔

(ج) علی گڑھ کالج سے شبلی کی علیحدگی کا ذکر کرتے ہوئے، سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں ان اختلافات کو گنا یا ہے جو شبلی کے ”سرسید کے حلقہ سے علانیہ باہر نکلنے“ کا باعث ہوئے اور اس ضمن میں، عقیدت مند شاگرد کے قلم نے عجیب بہار آفرینیاں کی ہیں۔

سرسید کی نسبت سید سلیمان نے جو کچھ بالصراحت کہا ہے یا بالا یا نمایاں کیا ہے۔ اس کا پتہ یہ ہے:-

”سرسید..... اپنے ہم نشینوں سے امتنا و صدقاً کے سوا کوئی اختلاف رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔“ مسلمانوں کی موجودہ تمدنی و معاشرتی بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں۔“ شبلی اور سرسید کے درمیان اس لئے جھگڑ ہو گیا کہ ”آخر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے وہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں۔ مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے۔“ ”عربی تعلیم کی ترقی و اصلاح کا مسئلہ دوسرا باب ہے جس میں دونوں کو اختلاف تھا۔ سرسید جدید انگریزی تعلیم کے علاوہ مسلمانوں میں

ریسی تعلیم کے شیوع کو جو ان کو اُدھر سے ہٹائے۔ مسلمانوں کے حق میں
مفسر سمجھتے تھے..... ان کو مشرقی علوم اور عربی تعلیم سے اس لئے دلچسپی
نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکیں گے۔“

اس کے علاوہ سید سلیمان نے شبلی اور سرسید کے سیاسی اور مذہبی
اختلافات پر بھی زور دیا ہے۔ جہاں تک سیاسیات میں کسی عملی اقدام کا
تعلق ہے۔ شبلی کے کارناموں کا ذکر آگے آئے گا اور مذہبی خیالات کے
بارے میں مذہبی علما ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان باتوں میں شبلی اور سرسید
کوئی حقیقی فرق تھا یا نہیں [اور دہلی و دیوبند کے علما نے اس بارے میں
شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی!] لیکن جہاں تک سرسید کے متعلق سید سلیمان
کے مندرجہ بالا ارشادات ہیں۔ ان میں شاگردانہ فرط عقیدتِ عدل و انصاف
ہی نہیں بلکہ سچائی اور صحتِ بیان کو بھی اس طرح چاروں شانے چیت گرایا
ہے کہ الاماں!!

مثلاً فرد جرم کی پہلی مد کو لیجے اور ایک مشتاقِ انشا پرداز جس طرح واقعات
اور الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اس کا ملاحظہ کیجے۔ سید سلیمان نے اس بات
کی تائید میں کہ سرسید ”اپنے ہم نستیوں سے اُمتا و صدقاً کے سوا کوئی اختلاف
رائے برداشت نہیں کر سکتے تھے“ حالی کی حیات جاوید کا حوالہ دیا ہے۔
فرماتے ہیں:-

”حیاتِ جاوید اول صفحہ ۲۹۰ میں مولانا حالی نے دے بے لفظوں میں اس کا اقرار
کیا ہے۔ لکھا ہے۔ ”کہ اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں بالکل ایک
ڈپسٹا تک طبیعت کے آدمی تھے۔ اس خصلت کو چاہو۔ ان کے بُرے کاموں
کی بنیاد سمجھو۔ اور چاہو۔ ان کے اخلاقی عیوب میں شمار کرو۔ بہر حال

یخصلت ان میں ضرور تھی۔“

غالباً اس اقتباس میں سرسید کے تمام بڑے بڑے کاموں کے بجائے بڑے کاموں کا ذکر اصلاحِ کاتب ہے لیکن سید سلیمان نے حالی کا بیان نقل کرتے ہوئے جس احتیاط اور انصاف سے کام لیا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اُنھوں نے حالی کا پورا اندراج نقل نہیں کیا اور ایک نامکمل اقتباس دے کر سرسید کے طریق کار کی نسبت جو کچھ حالی نے بالوضاحت کہا ہے بالکل اس کے برعکس اس سے منسوب کر رہے ہیں۔ حیاتِ جاوید میں یہ اندراج اس طرح ختم ہوتا ہے:-

گودہ (سرسید) جزوی اور فروعی باتوں میں اختلاف رائے سے تنگ دل نہ ہوتے تھے مگر جس اصول پر اُنھوں نے کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ ان سے وہ ہرگز دست بردار نہیں ہونا چاہتے تھے اور جس بات کو ان میں محل سمجھتے تھے۔ اُس کو جہاں تک ان کے امکان میں تھا۔ چلنے نہیں دیتے تھے۔

سرسید ایک عملی آدمی تھے جو شخص ان اصولوں کی مخالفت کرتا۔ جن پر اُنھوں نے کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کی وہ ضرور مخالفت کرتے لیکن حالی صاف کہتا ہے کہ وہ باقی جزوی اور فروعی باتوں میں اختلاف رائے سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے!

حالی کا حوالہ نقل کرنے میں سید سلیمان نے عالمانہ احتیاط اور تقویٰ کا جو نمونہ پیش کیا ہے۔ اس پر تبصرہ تفصیل حاصل ہے لیکن اس بارے میں حالی کی رائے پر فیصلہ چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسرے ذیلوں سے بھی سید سلیمان کے الزام کی حقیقت پرکھی جاسکتی ہے اور یہ تو یہ ہے کہ شبلی اور سرسید کا تسلسلِ تعلقات ہی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ سرسید

پنے ہم نشینوں سے اُمتا و صدقاً سُننے پر ہرگز مُصر نہ تھے۔
 شبلی خود لکھتے ہیں۔ ”سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا لیکن پولیسک مسائل
 میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا..... اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔ شبلی
 کے خطوط سرسید کے نام پڑھ لیجئے اور دیکھئے کہ سرسید اپنے کالج کے
 تنخواہ دار ملازموں سے کس حد تک اُمتا و صدقاً سُننے پر مُصر تھے!
 شبلی قسطنطنیہ سے سرسید کو خط لکھتے ہیں لیکن اس خط میں بھی سرسید
 کے نظریہ تعلیم، یعنی جدید تعلیم کی اشاعت، پر نکتہ چینی کی ہے۔

افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ
 تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا پر تو نہیں۔ جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے
 لیکن دونوں کی حدود جدا رکھی گئی ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈ
 نہ ملیں گے اصلی ترقی نہ ہو سکے گی۔ یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے۔

جس کا ردنا ہے!

سید سلیمان اگر خطباتِ شبلی پر ہی نگہ غائر ڈالتے۔ جسے انھوں نے خود
 مرتب کیا ہے تو وہ دیکھنے کہ اس مجموعہ میں شبلی کی جتنی تقریریں ان مسائل
 پر ہیں جن پر سرسید نے بھی تقریر کی۔ (یعنی پہلی اور تیسری) وہ سب کی سب
 سرسید کے خلاف ہیں: ایک تقریر کے تیور ملاحظہ ہوں :-

میں سکریٹری صاحب (یعنی سرسید) کے ان الفاظ سے کہ ”ہماری کانفرنس [یعنی
 محمدن ایجوکیشنل کانفرنس] بے فائدہ چیز ہے اور مفت میں ہزاروں روپے برباد
 کرتی ہے“ ہرگز اتفاق نہیں کر سکتا بلکہ اگر سکریٹری صاحب معاف فرمائیں تو یہ
 کہہ سکتا ہوں کہ ان کی یہ رائے غلط اور بالکل غلط ہے۔

اس کا جواب سرسید نے نہایت قنات اور خندہ پیشانی سے دیا :-

گو کہ مولانا شبلی اس رائے کو غلط بتاتے ہیں مگر بلاشبہ اس قدر افسوس مجھ کو ہے کہ آج تک کسی شخص نے یہ نہیں بتایا کہ ان ہدایتوں یا راہوں پر جو ہماری مجلس تعلیمی نے قرار دیں پورا پورا عمل کیا گیا؟..... ہماری قوم کی مثال اس شخص کی ہے جو طبیب سے نسخہ لکھوائے اور دوا کا استعمال نہ کرے اور چاہے کہ صرف نسخہ ہی لکھوا لینے سے بیمار کو شفا ہو جائے۔

اب ناظرین شبلی کے اپنے الفاظ سے ہی اندازہ لگالیں کہ وہ کس حد تک سرسید کے سامنے امتنا و صدقہ کیا کرتے تھے اور پھر یہ سوچیں کہ کیا اس اختلاف رائے کی بنا پر سرسید نے شبلی کو کالج سے نکال دیا؟ یا ان کے لئے کالج میں زندگی دو بھر کر دی؟ واقعہ یہ ہے کہ سرسید کا جنازہ کالج سے پہلے نکلا اور شبلی کالج سے علیحدہ بعد میں ہوئے!!

اسی حال اس بیان کا ہے کہ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان مذہب کے سوا بات میں انگریز ہو جائیں۔ جب تک سید سلیمان یہ نہ بتائیں کہ سرسید نے کن تحریروں میں یہ تصریح کی ہے اور کن الفاظ میں۔ اس بیان کی صحت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا لیکن ناظرین سرسید اور ان کے بیٹے سید محمود کی تصویروں ہی اٹھا کر دیکھ لیں اور اندازہ کر لیں کہ وہ کس حد تک انگریز بن گئے تھے؟ سلیمان صاحب نے سرسید کی سوانح عمری کے سوال پر تفصیل سے لکھا ہے اور اس ضمن میں ان کے تمام اندراج کا حاصل یہ ہے کہ سید احمد خاں اس گھٹیا قسم کا انسان تھا کہ وہ شبلی کا اس لئے مخالف ہو گیا کہ شبلی نے اس کی سوانح عمری لکھنے سے انکار کر دیا۔ افسوس ہے کہ سلیمان صاحب نے سرسید کو کبھی اپنے استاد کے ظرف سے ناپا ہے اور یہ بھول گئے کہ ٹھوس اور جامد چیزوں کے لئے وہ پیمانے کام نہیں آتے جن سے تیزال چیزیں ناپی جاتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ شبلی نے، مہدی حسن، ابوالکلام آزاد اور خود سید سلیمان سے
 خطوں میں سوانح عمری لکھنے کی، کہیں کنائے اشارے سے اور کہیں صاف
 صاف، خواہش ظاہر کی لیکن جب تک سرسید کی نسبت اس طرح کا اظہارِ خیال
 کسی قابلِ اعتماد ذریعے سے ہم تک نہ پہنچے۔ اس پر یقین کس طرح آسکتا ہے؟
 سید سلیمان نے سرسید کی فرد جرم میں یہ اضافہ کرنے کے لئے زبانی روایات
 پر بھروسہ کیا ہے اور ان روایات کے لئے بھی انھوں نے شبلی کے غالی
 عقیدت مندوں کے حلقہ ارادت سے باہر آنے کی ضرورت نہیں سمجھی یا نا اہل
 سوانح نگار کو کیا سہولتیں میسر ہیں۔

خود کوزہ و خود کوزہ گرد و خود گل کوزہ!

لیکن روایت و درایت کے اصولوں کے ماہر ہونے کی حیثیت سے سید صاحب
 یہ تو جانتے ہوں گے کہ اختلافی معاملات میں گھریلو روایتیں کام نہیں دیتیں۔
 اس میں راست بیانی اور دروغ گوئی کا سوال نہیں۔ ذہن انسانی کی کمزوریوں
 اور مجبوریوں کا سوال ہے۔ غالباً مولوی اقبال احمد سہیل اور سلیمان یہ دعویٰ
 تو نہ کریں گے کہ شبلی کے معاملے میں وہ ایک غیر جانبدار حیثیت رکھتے ہیں لیکن جانبداری
 کے فقدان کے علاوہ اصل کھٹن مسئلہ یہ ہے کہ کیا رادیوں کا حافظ اس قدر درست
 و مستحکم اور ان کا مشاہدہ اس قدر صحیح ہے کہ پچاس ساٹھ سال کی پُرانی باتوں میں
 ان پر اعتماد کیا جائے؟

انسانی حافظے پر اعتماد کرنے سے (جہاں جانبداری یا غیر جانبداری کا بھی
 کوئی سوال نہ ہو، جو غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان سے حیاتِ شبلی کا فاضل
 مصنف نا آشنا نہیں مثلاً مولوی عبد اللہ حق مصنف البراکہ کی یاد ایام کی نسبت
 انھوں نے خود یہ شعر نقل کیا ہے۔

وقتِ پیری شباب کی باتیں

ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں!

اسی طرح انھوں نے شبلی کے عزیز شاگرد، مولانا ضیاء الحسن علوی کا ایک طویل بیان، شبلی کے آخری ایام کی یاد میں درج کتاب کیا ہے لیکن اس میں بیانِ واقعات کی اس قدر واضح غلطیاں تھیں کہ انھیں نوٹ لکھنا پڑا۔ ”مضمون نگار کو واقعہ کی صحیح تاریخ میں کچھ تشابہ ہو گیا۔“

اسی طرح ۱۹۱۴ء میں ندوۃ العلماء کی اسٹرائٹک کا مسئلہ ہے جس کا ایک سبب یہ بتایا جاتا تھا کہ کارکنانِ ندوہ کے حکم سے مفتی محمد عبداللہ ٹوکی نے شبلی کے درسِ بخاری کی ممانعت کر دی۔ شبلی کہتے تھے کہ مفتی عبداللہ صاحب نے اس حکم کا ذکر خود ان سے کیا لیکن مفتی صاحب شبلی کی اس روایت کو غلط بتاتے تھے۔ اس پر شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:-

مولانا عبداللہ صاحب نے ایک نہیں، متعدد دفعہ مجھ سے صحیح بخاری کے سبقِ رد پر اپنی مجبوری ظاہر کی اور کہا کہ میں کیا کروں.....

اب اگر مولانا موصوف ان واقعات سے منکر ہیں تو خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون اس کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

جب دو مقدس ہستیاں، ایک ہی واقعہ کے بیان میں اس قدر مختلف ہو سکتی ہیں تو ان کے شاگردوں اور عام دنیا داروں کی کیا کیفیت ہوگی؟ لیکن زبانی روایات پر بھروسہ کرنے کی اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز مثال، مکاتیبِ مہدی میں ملتی ہے۔ مہدی حسن صاحب نے ایک مضمون

میں آزاد اور مولانا نذیر احمد کا ایک ایسا واقعہ بیان کیا۔ جسے اُنھوں نے مولانا شبلی کی زبان سے سنا تھا لیکن مولانا عبد الماجد دریا آبادی جو اس واقعہ کے قائل نہ تھے۔ اس کی تردید چھاپنا چاہتے تھے۔ (اور وہ بھی مولانا شبلی کی زبانی !!) مہدی حسن، ماجد صاحب کو لکھتے ہیں :-

آزاد اور نذیر احمد کا واقعہ ایک غیر ضعیف راوی یعنی خود شبلی کا بیان کردہ ہے۔ آزاد کے استاد اُنٹھا ٹھ کے سلسلہ میں مولانا نے یہ تذکرہ فرمایا تھا۔

کہیں آپ کو ہو تو نہیں ہوتا۔ تردید کیسی ؟ اور وہ بھی شبلی کی زبانی !!

انسانی حافظے کی یہی بولالعجبیائیں ہیں۔ جن کی بنا پر کوئی محتاط مورخ یا تذکرہ نگار اختلافی مسائل میں زبانی روایات پر اعتماد نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ انھیں تائید یا تائید مزید کے لئے لاتا ہے لیکن سید سلیمان ان ہی روایات کی بنا پر عجیب و غریب نظریوں کی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ جب وہ ان گھریلو روایات کی تائید کے لئے کوئی تحریری حوالہ دیتے ہیں تو جس بے تکلفی سے وہ اسے نقل کرتے ہیں یا اس کا خلاصہ دیتے ہیں۔ اس سے صاف نظر آ جاتا ہے کہ شبلی کے معاملے میں ان کی اہمائی بڑی خطرناک ہے !

مثلاً وہ یہ لکھ کر کہ ”آخر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی جائے“ اس پر ایک فٹ نوٹ بڑھاتے ہیں ”حیات جاوید“ میں مولانا حالی نے بھی ان کی اخیر عمر کی اس خواہش کا ذکر کیا ہے“ لیکن اگر آپ حیات جاوید اُٹھا کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ حالی کہیں یہ نہیں کہتا کہ سرسید کی یہ خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری ”لکھی جائے“ بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ سرسید شروع میں اپنی سوانح عمری

لکھے جانے کے خیال کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ لیکن جب سوانح عمری لکھی جانی شروع ہو گئی بلکہ بہت حد تک لکھی جا چکی تو وہ ایک خاص وجہ سے (جس کی حالی وضاحت کر دیتا ہے)۔ یہ جاننے کے مشتاق تھے کہ اس میں (یا کم از کم اس کے ایک خاص حصے میں) کیا لکھا جا رہا ہے۔

حیاتِ جاوید کا متعلقہ اندراج حسب ذیل ہے:-

اول اول تو جب کبھی سرسید کے سامنے ان کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ میری لائف میں، سوا اس کے کہ لڑپن میں خوب کبڑیاں کھیلیں۔ کنکوے اڑائے۔ کبوتر پالے۔ ناچ بجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نجری، کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے مگر آخر میں جیسا کہ عام طبائع انسانی کا خاصہ ہے۔ ان کو اس بات کے درایت کرنے کا زیادہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ ان کی اخیر یا بوگرانی میں کیا لکھا جا رہا ہے اور اسی لئے وہ اپنی لائف کے جلد شائع ہونے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص نے چالیس برس مذہب کی حماقت میں بسر کئے ہوں اور سوائے تکفیر و تذلیل کے قوم کی طرف سے کچھ انعام نہ پایا ہو۔۔۔ اس سے زیادہ کون شخص اس بات کے دیکھنے کا خواہشمند ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان اس کی مذہبی تصنیفات سے نظر انصاف سے بحث کرے۔ پس اگر ہم یہ جانتے کہ سرسید کا ناگزیر وقت قریب آ پہنچا ہے تو کم سے کم جو کچھ ہم نے سرسید کی مذہبی خدمات کی نسبت لکھا تھا وہ ضرور ان کی نظر سے گزران دیتے

حالی بطور ایک سوانح نگار کے شبلی سے کم پایہ کا نہیں۔ اگر ایک کی الفائدہ اردو ادب کا زور سے تو دوسرے کا مادگار مذہب سوار اور ہکات بہا

خزانہ ہے لیکن سرسید نے حالی کے لائف لکھنے پر جن خیالات کا اظہار کیا۔
ان ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی سوانح عمری لکھوانے کے لئے کس
طرح بیتاب تھے !!

مندرجہ بالا اقتباس میں حالی نے صاف بتا دیا ہے کہ جب انھوں نے
سرسید کی لائف لکھنے کا خیال ظاہر کیا تو سرسید اس خیال کا مذاق اڑاتے
رہے اس کے علاوہ حیات جاوید کے دیباچہ میں حالی یہ بھی بتا دیتے ہیں
کہ شروع میں جب انھوں نے سرسید کی سوانح عمری لکھنی چاہی تو
سرسید نے کس حد تک ان کی مدد کی !
حالٰی یہ لکھ کر کہ انھوں نے سرسید کی زندگی کے واقعات قلمبند کرنے
شروع کر دئے تھے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں :-

میں نے..... کم بیش سو سوال ایک کاپی میں لکھ کر سرسید کے پاس بمقام
علی گڑھ اس غرض سے بھیجے کہ ان کے جواب مختصر طور پر لکھ دیں مگر وہ کاپی
ان کے پاس یوں ہی پڑی رہی۔ کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ ملا۔
حیات جاوید کے دیباچہ سے ہم نے جو طویل اقتباسات دئے ہیں
ان سے ناظرین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حالی نے کیا کہا اور سید سلیمان
اس سے کیا منسوب کر رہے ہیں لیکن بیان واقعات میں سید صاحب نے
جوبے تکلفی برتی ہے۔ اس کے نمونے حیاتِ شبلی کے ہر صفحے پر یکھ کر
پڑے ہیں اور سرسید اور حالی کے بیانات خاص طور پر اس کے تحتہ مشق
بنے ہیں۔ مثلاً حیاتِ جاوید کے متعلق شبلی کے جملے کے ٹھنڈے فقرے کا ذکر کر کے
سید سلیمان لکھتے ہیں :-

”لکھی جی مولانا (شبلی) نے اس کتاب کو مدلل مداحی یا کتاب المناقب کہا جس سے مولانا

حالی کی تنقید مقصود نہ تھی بلکہ مقصود تھا کہ اس کتاب میں صاحبِ سوانح کی زندگی کے دونوں رخ نہیں۔ مولانا حالی کو اس کی کا احساس خود بھی تھا چنانچہ انھوں نے دیباچہ میں خود اپنے اس احساس کی تشریح اور اپنے طرزِ عمل کی توجیہ کی ہے۔

پتہ نہیں۔ سید سلیمان دوسروں سے بیانات منسوب کرتے وقت فقط اپنی یاد پر بھروسہ کر کے انھیں دیکھتے نہیں یا انہیں خیال ہے کہ کوئی دوسرا انھیں کھول کر نہیں دیکھے گا۔ انھوں نے آخری دو فقروں میں جو کچھ حالی سے منسوب کیا ہے۔ وہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔ حالی کو حیاتِ جاوید کی نسبت ہرگز یہ احساس نہ تھا کہ اس میں سرسید کی زندگی کے فقط ایک (خوشنما) رخ کی تصویر ہے اور انھوں نے اس احساس کی کوئی توجیہ نہیں کی بلکہ وہ تو حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے سعدی اور غالب کی سوانح لکھیں۔ لیکن اصحابِ تذکرہ کے ”بھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی“ لیکن حیاتِ جاوید کی نسبت وہ بالقرع بناتے ہیں کہ اس میں انھوں نے سرسید کی زندگی کے دونوں رخ دکھائے ہیں اور اس پر نکتہ چینی کا پورا قصد کیا ہے۔ وہ اس کتاب کے متعلق دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے بس ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیوں کر لکھی جاسکتی ہے ہر در ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر رکھا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

حیاتِ جاوید کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے دیباچہ میں حالی نے نکتہ چینی کا جوادعا کیا تھا۔ اس میں وہ پورے نہیں اُترے [اگرچہ حالی نے ملائم اور متین طریقے سے جا بجا سرسید کی بعض چیزوں پر حشمتِ نمائی کی ہے اور حیاتِ شبلی میں سرسید پر جتنے جائز اعتراضات ہیں۔ ان سب کے ساتھ حیاتِ جاؤ کا حوالہ موجود ہے]۔ لیکن کم از کم سید سلیمان کا یہ فرمانا کہ حالی کو اصل مراکھیاں تھیں تھا کہ حیاتِ جاوید میں سرسید کی زندگی کا فقط ایک رُخ ہے اور انھوں نے دیباچہ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ صریح غلط بیانی ہے۔

تعجب ہے کہ تحریری حوالوں کے اندراج اور تلخیص میں تو حضراتِ ندوہ اس شدید احتیاط اور درست بیانی کا ثبوت دیتے ہیں اور ساتھ ہی یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کے حافظے پر ایمان لاکر، ان کی زبانی روایات کو صحیح مان لیا جائے۔ خواہ تمام قرائن اور واقعاتِ معلومہ ان کے برخلاف کیوں نہ ہوں! بظاہر اس خواہش کی تعمیل روایت و درایت کے تمام اصولوں کے خلاف ہے لیکن ہم ناظرین سے کہیں گے کہ وہ سرسید کی سوانح عمری والا قصہ صحیح مان لیں۔ بات تو عجیب ہے اور سرسید کی شخصیت کا جو نقشہ دوست دشمن نے کھینچا ہے اس پر کسی طرح نہیں پھبتی لیکن مولوی اقبال احمد سہیل اس قصہ کے راوی ہیں اور مولانا سلیمان ندوی، اس کے ناقل۔ ان پر کیوں نہ اعتماد کیا جائے؟

حدیث اگرچہ غریبا ست راویان ثقہ اند! لیکن عربی کی تعلیم سے سرسید کی جس مخالفت کا سید سلیمان نے ذکر کیا ہے۔ اس کے متعلق ہم حیران ہیں کہ ان کے بیان کو صحیح تسلیم کریں یا ان کے استاد کے ارشاد کو جو مولوی بشیر الدین کا ایک فقرہ نقل کر کے لکھتے ہیں :-

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ صرف انگریزی علوم و فنون میں کمال حاصل کرنا اور عربی
زباہ اور مذہبی علوم سے بے بہرہ ہونا تا دینی و دنیوی ترقی کا وسیلہ ہے؟ اگر یہ
مطلب ہے تو محض ہمت ہے کہ سرسید مرحوم کا یہ خیال اور یہ رائے تقبی۔
اس مجلس مقدس میں بچا رہے سرسید کو کہاں بارل سکتی ہے۔ لیکن اگر سید سلیمان
کے ایوان عدالت میں ملزم کو بھی کچھ بولنے کا حق حاصل ہے تو سرسید کا اپنا
بیان بھی موجود ہے۔ وہ نواب عماد الملک کو مسلمانوں کی عام تعظیم کا ذکر کر کے
لکھتے ہیں :-

اسی کے ساتھ یہ تدبیر چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درسی کتب مذہبی جو معدوم
ہو جاتا ہے کسی طرح قائم رہے۔ اگر عربی اور فارسی ہم میں سے معدوم ہو جاتا
تو اس کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے گی۔
شبلی کی زندگی میں ایک مرتبہ سید سلیمان نے اپنے اُستاد کی حمایت میں
قلم اٹھایا تھا اور ان کے مخالف مولوی خلیل الرحمن سہارنپوری سے ایک
اخبار میں بعض ایسے سوالات کئے تھے۔ جن کی تہ میں الزام اور اعتراض تھے
لیکن یہ الزامات بے بنیاد تھے۔ اس پر ان کے کامل الفہم اُستاد نے
انہیں ٹوٹا کا اور ایک خط میں انہیں لکھا :-

تم نے ویل میں جو سوالات ناظم سے کئے ہیں۔ اُس کے اکثر تیر ہوائی ہیں
سرسید کے خلاف بھی سید سلیمان نے بہت سے ”ہوائی تیر“ چلائے ہیں
اور وہ بھول گئے کہ ان ہوائی تیروں سے سرسید کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔
انہوں نے جو کچھ کیا ہے۔ اُستاد کی محبت سے سرشار ہو کر کیا ہے۔ لیکن شبلی
کے متعلق ان کی فرط عقیدت کا یہ پہلو ایسا ہے کہ اگر شبلی اس پر (مولوی
خلیل الرحمن پر کئے ہوئے اعتراضوں کی طرح) ”مجھے میرے دوستوں سے“

بجاؤ کہیں تو بجا ہے۔ سید سلیمان نے شبلی کے خطوط مضامین۔ اشعار مرتب کئے ہیں۔ ان چیزوں کو مرتب کرتے وقت انھوں نے بہت سی قابل اعتراض باتوں پر سیاہی پھیر دی ہے لیکن عقیدت مند آنکھوں کو قابل اعتراض باتیں مشکل سے ہی نظر آتی ہیں اور سید سلیمان کی احتسابی کار فرمائی کے بعد اب بھی ان چیزوں کا یہ عالم ہے کہ آپ شبلی کی شخصیت کے خلاف کوئی فرد جرم مرتب کرنا چاہیں تو آپ کو شبلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ناید دستاویزات مل جائیں گی۔ اپنے استاد پر یہ احسان کر کے اور حیات سبلی میں بھی بعض ایسے رخنے چھوڑ کر جن سے شبلی کی اصل شخصیت پر تھوڑی بہت نئی روشنی پڑ جاتی ہے۔ سید سلیمان اب ایسے اپنے استاد کی خیر خواہی سمجھتے ہیں کہ ہر اس شخص کا منہ چڑھائیں جس کا قد و قامت شبلی سے بلند ہے!

ہم سید سلیمان سے ان کے ایک دوست کے الفاظ میں پوچھتے ہیں کہ شبلی محل میں بیٹھ کر دوسروں پر پتھر پھینکا خوش ادائیگی لیکن کیا بغل ڈالنا بھی ہے؟ انھوں نے فارسی کا وہ پُرانا شعر تو منا ہو گا۔

چوں خدا خواهد کہ یرودہ کس درد

سیلش اندر طعنہ نیکاں دہد!

سید سلیمان کی اس روش کا جو نتیجہ ہو گا وہ ظاہر ہے۔ (اور ہم نے سنا ہے کہ

ان کی کتاب کے جواب میں شبلی کے قدیمی دوست اور محسن مولوی محمد امین بیری ایک تفصیلی کتاب لکھ رہے ہیں) لیکن سید صاحب کی اس ”نادان دوستی“ کا ہمیں اس لئے بھی افسوس ہے کہ انھوں نے سرسید کی جو بھونڈی اور خلاف واقعہ تصویر کھینچ کر بچا رہے شبلی کی مخالفت کا سامان کیا ہے۔ وہ شبلی کے دل و دماغ کی نہیں شبلی کو سرسید سے لاکھ اختلاف سہی لیکن سرسید کی نسبت

ان کی وہ گری ہوئی رائے ہرگز نہ تھی جو سید سلیمان کی ہے جنھیں سرسید کو قریب سے دیکھنے کا کوئی موقع نہیں ملا یا ان لوگوں کی ہے جو حقیقی واقعات سے بے خبر ہیں اور سرسید کو فقط مولوی طفیل احمد منگھوری کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ آپ سرسید کے اس کارٹون کو دیکھیے، جو سید سلیمان نے حیاتِ شبلی میں پیش کیا ہے اور اس کا شبلی کی اس تصویر سے مقابلہ کیجئے جو شبلی نے اس وقت کھینچی۔ جب وہ ملائیم سرسید کے خلاف صف آراء تھے شبلی مسلم گزٹ کے مشہور سلسلہ معنائین میں سرسید کی نسبت لکھتے ہیں:-

وہ پُر زور دست و قلم، جس نے اسبابِ بغاوتِ ہند لکھا تھا اور اُس وقت لکھا تھا جب کو رٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اڑادی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹیکلوں پر لکھا۔ کانگریس کا لڑیچہ حقوقِ طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پُر زور لڑیچہ نہیں پیدا کر سکتا وہ جاں باز جو اگرہ کے دربار سے اس لئے برہم ہو کر چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندو متاویوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر درجہ پر نہ تھیں۔ وہ افسانہ پرست۔۔۔

سید سلیمان نے اس بات پر... زور دیا ہے کہ سرسید کی وفات پر شبلی نے کوئی مرثیہ نہیں لکھا۔ مرثیہ نہ لکھنے کے بیسیوں وقتی اسباب ہو سکتے ہیں لیکن سرسید کی وفات پر شبلی نے.....

..... جو نہایت مختصر سا خط ایک دوست کو لکھا۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شبلی کس حد تک سرسید کی عظمت اور قومی اہمیت کے معترف تھے۔ یہ خط سوائے ایک شعر کے تمام تر عربی میں لکھا گیا اور ہم سید سلیمان کی کتاب سے ہی اس کا ترجمہ

پیش کرتے ہیں :-

نئے دائم حدیث نامہ چوں است
ہمیں دائم کہ عنوانش بچوں است
قومی عمارت کے ستون ہل گئے۔

یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں گئے۔
یہ سائنسہ یکنشہ ۲۰۰۰ء کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ
بجھ گیا۔

میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا۔
شبلی کی علی گڑھ کالج سے علمدگی کا ذکر کرتے ہوئے 'سید سلیمان سے
شبلی اور سرسید کے اختلافات کی جو بحث پیٹریڈی ہے اور جس انداز سے اس
بحث کو نبایا ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف شبلی کے حق میں نیک نہ ہوگا بلکہ
ہمارے خیال میں سرے سے بحث غیر ضروری ہے۔ کالج سے شبلی کی علی گڑھ
کے لئے شبلی اور سرسید کے اختلافات گنانے کی کوئی ضرورت نہیں لکھا اس
کی وجہ نہایت وضاحت سے حضور نظام کے اس فرمان میں ہے
جس میں شبلی کے ام تصنیفی وظیفے کا اعلان ہے اور جس کے بعد شبلی نے حج
میں مستقل قیام کا خیال ترک کر دیا۔ اس فرمان کے الفاظ ہیں :-

مولوی شبلی صاحب جو اس وقت علی گڑھ کالج میں عربی اور فارسی کے
پروفیسر ہیں چار ہفتے سے بلدہ میں مقیم ہیں۔ مولوی صاحب ایک نہایت
قابل اور لائق شخص ہیں اور تصنیف میں ایک خاص مذاق رکھتے ہیں۔
اب ان کی تنہا یہ ہے کہ اپنے پورے وقت کو تصنیف کے کام میں صرف
کریں اور معمولی درس و تدریس کو ترک کر دیں۔

کانج سے شبلی کی علحدگی کا باعث سرسید سے اختلافات نہ تھے کیونکہ اگر شبلی کے لئے سرسید کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل ہوتا تو وہ سرسید کی زندگی میں ہی کانج سے علیحدہ ہو جاتے بلکہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ کانج کی معمولی درس و تدریس سے ان کے تصنیفی کاموں میں ہرج ہوتا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اپنے اصل کام یعنی تصنیف و تالیف کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت نکالیں !

شبلی کے بہت سے مخلص دوست، ان کے علی گڑھ چھوڑنے کے خلاف تھے۔ مہدی حسن انھیں ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ”یہ میرے دل کا چور ہے۔ جسے آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ میں آپ کو کانج میں دیکھنا چاہتا تھا، لیکن ہمارے خیال میں شبلی کا فیصلہ صحیح اور ٹھوس وجوہ پر مبنی تھا۔ شبلی نے عمر کے آخری دو تین سال میں علی گڑھ کی جس طرح مخالفت کی وہ ضرور افسوسناک ہے۔ اس سے نہ صرف شبلی یا ندوۃ العلماء کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ جیسا کہ شبلی نے بالآخر محسوس کیا۔ قوم کو نقصان پہنچا اور قومی شیرازہ بکھر گیا۔ لیکن جہاں تک علی گڑھ چھوڑ کر تصنیف و تالیف میں مشغول ہونے یا ندوہ کی خدمت کرنے کا خیال تھا۔ یہ فیصلہ دانشندانہ تھا۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں، جب تک کسی جوہر قابل کے لئے خاص سہولتیں نہ بہم پہنچائی جائیں، معمولی درس و تدریس میں قابل اساتذہ کے وقت کا جس طرح خون ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ شبلی کو نظر آتا تھا کہ یہ کام تو کوئی درجہ کر سکتا ہے۔ وہ کیوں نہ اپنے میں اس چیز کے لئے وقت کریں جس کے لئے وہ خاص طور پر موزوں ہیں اور اگر ہم ان علمی، ادبی اور قومی کارناموں کا

موازنہ، جو شبلی کے آخری سولہ سالوں میں عمل میں آئے۔ ان کاموں سے کرپس جو شبلی نے علی گڑھ کے سولہ سالہ قیام میں کئے تو صاف نظر آتا ہے کہ شبلی کا فیصلہ نہ صرف ان کی ذات کے لئے، بلکہ قومی نقطہ نظر سے بھی صحیح تھا۔

شبلی کی زندگی میں غور و فکر اور عبرت آموزی کا بڑا سامان ہے وہ ایک کامیاب والا الغزم باپ کے بیٹے تھے۔ خود بھی شروع سے بلند حوصلہ اور عالی ہمت تھے۔ علی گڑھ آنے سے پہلے ان کے ارادوں کی راہ ابھی معین نہ ہوئی تھی بلکہ جس طرف ان کا جوشِ طبیعت انھیں لے جا رہا تھا۔ ادھر کی راہ نور دی خدا داد و خوبیوں کا اتلاف بجا تھا۔ علی گڑھ پہنچ کر ان کی منزل مقصود طے ہو گئی اور ان کی زندگی کی ”اسکیم“ (جسے بنانے اور پیش نظر رکھنے کی یہ مرد باتدبیر اپنے سب لائق تلامذہ کو ہدایت کیا کرتا تھا) تیار ہو گئی۔ اب ان کی کشتی موجوں کے رحم پر نہ تھی بلکہ ان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ اس کی راہنمائی کرتا۔

شبلی کی منزل مقصود تو معین ہو گئی۔ لیکن کامیابی کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے انھوں نے فوراً سرتوڑ دوڑ نہیں شروع کر دی جس سے بالعموم پڑ جوش نوجوان اپنی مہم کا آغاز کرتے ہیں اور جلد ہی تھک کر یا راہ کی صعوبتوں سے گھبرا کر ہمت ہار دیتے ہیں۔ شبلی نے برسوں منزل اور جادۂ منزل کا مطالعہ کیا۔ دابیں بائیں سے چل پھر کر اس راہ کو قریب سے دیکھا۔ راہ کی مشکلات سے واقفیت حاصل کی اور جب تک ان کے پاس معقول زاد فراہم نہ ہو گیا۔ انھوں نے آگے قدم نہ بڑھایا۔ آزادانہ قومی خدمت کرنے کے ارادے ان کے ایک مدت سے تھے لیکن علی گڑھ میں انھوں نے اپنے

آپ کو اس کے لئے تیار کیا۔ اعلیٰ پیمانے پر کام کرنے کے جو وہاں نمونے تھے انہیں غور سے مطالعہ کیا۔ اپنے وقت کے سب سے بڑے ہندوستانی مسلمان کو برسوں قریب سے دیکھا جس طرح اس نے اپنی بیوی کی وفات کے بعد دوبارہ شادی نہ کی تھی۔ اسی طرح خود بھی ۱۸۹۵ء میں پہلی بیوی کی وفات پر دوبارہ تامل نہ کرنے کا عہد کیا۔ کتابیں اور نظمیں لکھ اور چھپو اگر اپنی استعداد اور عوام کی گردیدگی کا اندازہ لگایا۔ اس کے باوجود وہ علی گڑھ سے اس وقت تک علیحدہ نہ ہوئے جب تک انہوں نے حیدر آباد کے وظیفہ سے ”زادِ راہ“ کا پورا سامان نہ کر لیا اور طبعی علیحدگی اس وقت اختیار کی۔ جب حالات نے بالکل مجبور کر دیا ہے

چاک کرمت جیب بے ایام گل

کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہئے!

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ادبی شاہکار تذکرہ میں شبلی کی غیر معمولی احتیاط پر حشیم نمائی کی ہے۔ بلاشبہ جن مساعد حالات سے شبلی کو سابقہ پڑا۔ ان کی وجہ سے یہ سانپ کا ڈسا ہوا رتھی سے بھی ڈرجاتا تھا لیکن یہ فیصلہ تو اب مستقبل کا مورخ ہی کرے گا کہ شبلی اور ان کی قوم کے لئے شبلی کا تردد و تامل زیادہ مضر ثابت ہوا ہے یا مولانا ابوالکلام آزاد کی خوشنعمت عمدائی تین مطلق اور انانیت! :

کشمکش

علی گڑھ چھوڑنے کے بعد شبلی کو دو تین سال سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی صحت ان دنوں خراب رہنی شروع ہو گئی تھی اور وہ قیام کالج کے دوران میں ہی سیروسیاحت کے لئے کشمیر جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ کالج سے فراغت ملی تو دیرینہ ارادے کو پورا کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور کالج سے رخصت ہوتے ہی جون ۱۸۹۵ء میں انھوں نے کشمیر کا رخ کیا۔ یہاں پہنچ کر وہ سخت بیمار ہو گئے اور جب تک یہاں رہے۔ بیمار ہی رہے وہ سفر میں تنہا گئے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی ملازم بھی ساتھ نہ تھا۔ کشمیر کے احباب نے بڑی خدمت کی لیکن شبلی نے یہاں بہت مصوبتیں اٹھائیں اور جب طبیعت ذرا سنبھلی تو جولائی کے اخیر میں وطن کا رخ کیا۔

یہاں پہنچ کر انھوں نے افاروق کو جسے انھوں نے علی گڑھ چھوڑنے سے چار پانچ سال پہلے شروع کیا تھا۔ اختتام پر پہنچایا۔ لیکن صحت کا اب بھی یہ حال تھا کہ آج اچھی ہے تو کل خراب۔ بلکہ گھٹنے گھٹنے کے بعد حالت بدلتی تھی۔ اس دوران میں وہ لکھنؤ گئے۔ ندوہ کے دفتر میں قیام کر کے لکھنؤ کے اطباء کا علاج کیا لیکن طبیعت پھر بھی راہ پر نہ آئی اور وہ عظم گڑھ واپس آ گئے۔ نواب محسن الملک کو ان کی علالت کا پتہ چلا تو عیادت کیلئے

اعظم گڑھ آئے۔ تین دن تک مولانا کے مکان پر مقیم رہے اور انہیں دیکھ کر علی گڑھ واپس گئے۔

اس دوران میں مولانا کی حالت سنبھل گئی تھی لیکن اگلے سال ہی میں پھر مرض کا سخت دورہ پڑا اور مولانا نے دہلی جا کر حکیم عبد المجید خاں سے شورو کرنے کا فیصلہ کیا۔ نواب محسن الملک بھی ان کے ساتھ جانے والے تھے اور مولانا نے نواب حبیب الرحمن شروانی کو بھی لکھا کہ وہ حق دوستی ادا کریں اور ساتھ جائیں۔ مولانا کی بیماری کا یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ انہوں نے عالم بالوئی میرا پنی وصیت بھی لکھ لی۔ لیکن خدا کی شان ہے۔ انتہائی تاریکی کے بعد ہی صبح اُمید نو دار ہوتی ہے۔ وہ اس حالت میں تھے کہ اعظم گڑھ میں ایک مسلمان اسسٹنٹ سرجن (ڈاکٹر مصطفیٰ خاں) مقرر ہوئے۔ وہ مولانا کے بھائی مولوی محمد اسحاق کے دوست تھے انہوں نے یہ تشخیص کی کہ مولانا کا دل غایت ضعف سے اپنا کام ٹھیک طرح نہیں کر رہا ہے اور بڑی مستعدی سے اس ضعف کا علاج شروع کیا۔ ایک طویل سلسلہ علاج کے بعد جس میں مولانا کو ڈاکٹر مصطفیٰ خاں کی تبدیلی کے بعد گوندہ بھی جانا پڑا اور ایک ہزار سے زائد خرچ اٹھا مولانا کو صحت ہوئی اور وہ پھر سے قومی کاموں میں ہاتھ لگانے کے قابل ہوئے۔ حالی نے قطعہ تہنیت لکھا۔

شہد احمد پس از ناخوشی و رنج دراز شبلی ماہ مراد از سربالیں برخاست

بود در علت او علت قومی مضمر لاجرم صحت او بہر ہمہ قوم شفاست
بسکہ اور فرج و مہدست تاجیخ سلف ہر قدر فخر و ذاتش بگند قوم رواست

زندہ تادیر بہ مانا د کہ برقتہ کسے بعد از و خلعت تحقیق نمی آید راست !
 مولانا کی بیماری پتہ نہیں کس قسم کی تھی کہ ان کے معالج، ڈاکٹر مصطفیٰ
 خاں نے انھیں دوبارہ شادی کرنے کا مشورہ دیا۔ مولانا کی پہلی بیوی،
 اس سے پانچ سال پہلے وفات پا چکی تھی اور مولانا کا دوبارہ تاہل کا ارادہ
 نہ تھا لیکن اب طبی احکام کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ اتفاق سے جو لڑکی
 مولانا کو پسند آئی وہ بہت ہی کمسن تھی۔ مولانا کے کئی اعزہ اس رشتے کے
 خلاف تھے۔ مولانا نے وعدہ کیا کہ وہ شادی کے بعد کچھ وقت حالتِ مجردی
 میں گزار دیں گے اور یہ بھی گوارہ کرنے کو تیار تھے کہ عقد کے بعد دو سال تک
 لڑکی کا در کسی قسم کا آنا جانا کچھ نہ ہو۔ لیکن ان کے صاحبزادے حامد شبلی
 کو یہ رشتہ سخت ناگوار گزرا۔

ہم مولانا شبلی کے اس غم و غصہ کا ذکر کر چکے ہیں جو انھوں نے اپنے والد
 شیخ حبیب اللہ کی دوسری شادی پر محسوس کیا تھا۔ سوتیلی ماں کی آمد کے
 خیال سے ان کے بڑے بیٹے کی بھی وہی حالت ہو گئی جو ان کی اپنی ہوئی
 تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ حامد شبلی تو باپ کا گھری چھوڑ کر چلے
 گئے اور درجہ نگہ سے باپ کو خط لکھا کہ ”اب آپ مجھ سے باپس ہو جائے“
 باپ کو بیٹے کی اس حرکت کا بڑا رنج ہوا۔ چار وقت تک شبلی نے کھانا نہیں
 کھایا اور ہر وقت رویا کئے۔

درجہ نگہ سے حامد شبلی بہا ر شریف گئے۔ جہاں مشہور اہل قلم، صوفی بزرگ،
 شیخ شرف الدین یحییٰ میری کا مزار ہے۔ وہاں وہ سجادہ نشین صاحب کے
 مرید ہوئے۔ گیر واپڑے پہن کر ترک دنیا کیا اور ایک آدھ مہینہ بالکل جوگیوں
 کی طرح بسر کیا۔ اس دوران میں کسی وقت انھوں نے اپنے والد کا نام نہ لیا

سجاد نشین صاحب جو فارسی کے شاعر بھی تھے۔ مولانا کو خوب جانتے تھے۔ انھوں نے خط لکھ کر مولانا کو حامد کی آمد کے متعلق مطلع کیا اور اپنی بعض فارسی مثنویاں بھی ارسال کیں۔ مولانا کو بیٹے کا پتہ ٹھکانہ معلوم ہوا تو انھوں نے ایک دو معتبر آدمی بھیج کر اسے بلایا۔ حامد صاحب اب بھی آنے پر آمادہ نہ تھے لیکن مرشد نے مجبور کیا کہ اطاعت والدین ہر طرح فرض ہے اور انھیں حکم مرشد کی تعمیل میں والد کے پاس واپس جانا پڑا۔ مولانا شبلی ۵ ربیع الثانی ۱۲۹۷ء کو ایک خط میں اپنے بھائی مولوی محمد اسحق کو حامد کی نسبت لکھتے ہیں:-

”حامد کی نسبت تمام دنیا کے برخلاف میرا ہی خیال صحیح تھا۔ اس کے مفصل حالات عند الملاقات۔“

شفیع ماسٹر اس کو جا کر لے آئے لیکن جس لباس میں اس کو دیکھا۔ وہ گیردا کرتہ اور گیردا تہمد تھا۔ اس نے فقر اختیار کیا اور وہ مرت اس میں سے یہاں آنے پر راضی ہوا کہ اس کے پیر نے اس کو اطاعت والدین پر مجبور کیا وہ پھر جانے پر مصر ہے اور کسی طرح نہیں ٹھہرتا۔ فقر اچھی چیز ہے لیکن وہ جو گیانہ قالب میں بانا چاہتا ہے اور اس میں کوئی ریا کاری نہیں۔ فقط دماغ کی خرابی کا تصور ہے اور اصل چیز

میری قسمت “

شبلی کی بعض تحریریں اور ان کے حالات زندگی بہ نگہ غائر دیکھیں۔ تو خیال آتا ہے کہ ان کے والد کی دوسری شادی کے بعد ان کے آبائی گھر سے وہ فضا مفقود ہو گئی تھی جس میں والدین کو اولاد سے شفقت و محبت

..... اور اولاد کو والدین سے ارادت اور اطاعت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ شبلی کے مکتوبات شائع کرتے وقت ایک دو جگہ

ایسے مقامات پر سیاہی پھیر دی گئی ہے۔ جن میں شاید ان کے والد کی طرف زیادہ شکایت آئینا اشارہ ہے (مثلاً مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۴۴ میں) لیکن جو چیزیں باقی ہیں۔ ان سے بھی بیٹے کی شکر رنجی اور اختلافات کے اثرات صاف جھلکتے ہیں۔ اپنے والد کی زندگی میں شبلی نے اپنی سوتیلی ماں سے جو سلوک روا رکھا۔ ظاہر ہے۔ وہ ان کے والد کو سخت ناگوار ہو گا۔ اور تقسیم جائداد کے معاملے میں تو بڑے بیٹے کو باپ سے علانیہ اختلاف تھا۔ (اگر شبلی کی سعادت مہدی کی داد دینی چاہئے کہ انھوں نے یہ اختلاف ادا کی حد سے باہر نہیں ہونے دیا۔) اپنے سگے بھائی مہدی حسن سے جو بڑے بھائی کے مقابلے میں والد کے ہنجیال تھے۔ شبلی کو ان کے ولایت جانے کے بعد سے سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ تقسیم جائداد والے خطوں میں ”میاں مہدی“ کا صاف شکایت آئینا ذکر ہے۔ ایک اور خط میں کہتے ہیں۔ ”مہدی کے جب ایسے خط آیا کہ اس سے مجھ کو مشرف نہ کیا کرو۔“ مہدی کی وفات پر شبلی نے جو خط لکھا۔ اس سے بھی دو بھائیوں کی ناراضی کا پتہ چلتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے جائے گا در نہ مجھ پر لعنت آگے اس سے ناراض رہتا۔

ہائے سب برائیوں پر بھی وہ سب سے اچھا تھا
شبلی کو اپنے آبائی گھر میں پدرانہ خفقت اور برادرانہ محبت کا جب اس قدر تھوڑا حصہ ملا ہو تو پھر اس پر جائے حیرت نہیں کہ ان کی لہنی اولاد بھی اس معاملے میں بڑی خوش قسمت نہ تھی۔ شبلی کے کئی خطوں میں ان کے بیٹے حامد کا ذکر ہے۔ لیکن زیادہ تر شکایت سے لبریز ہے۔

بلکہ بعض جگہ تو سخت بیزاری کا اظہار ہے۔ ۸۹۸ء کے ایک فارسی خط میں مولوی محمد مسیح کو لکھتے ہیں (ترجمہ)

مادے نے اپنی سادگیوں سے جو راستہ نادر و غریب کی طرح تھیں۔ مجھے اس طرح فریفتہ کیا کہ میں نے کبھی اس کی طبیعت و عادات کو غور سے نہ دکھا لیکن اس دوران میں حالات سے ایک بیک پردہ اٹھ گیا اور پتہ چلا کہ اس ”تیرہ نخت“ بدترین نوجوانوں نے بات کو حد سے گزار دیا تھا۔ پھر بھی میں نے کچھ نہ کہا اور اپنے دل کو دانتوں سے چبا کر رو دیا۔ آگے چل کر اسی خط میں فرماتے ہیں (ترجمہ)

اگرچہ مادے میرا محبت کا تعلق یکبارہ ٹوٹ گیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے پھر اپنے پاس بلاؤں لیکن چونکہ دونوں گھروں کا ہی ایک پرغ ہے اس لئے علاج معالجہ ترک نہیں کیا جاسکتا۔ پتہ لگانا چاہئے کہ وہ تیرہ باطن اپنے کئے پر پشیمان ہے یا پہلے سے بھی زیادہ شوخ اور بے جا ہو گیا ہے۔

خامد شہلی کی نسبت تو شاید کہا جائے کہ انھوں نے جو حرکتیں مختلف موقعوں پر کیں ان سے پدری مہر و محبت کا سرچشمہ خشک ہو گیا لیکن شہلی کی دوری اولاد فاطمہ سے جن کی نسبت سید سلیمان کہتے ہیں۔ ”مولانا ان کو بہت چاہتے تھے“ اور جنھیں خود شہلی لکھتے ہیں۔ (اور کس قدر عزیز ناک عترت ہے!) کہ ”میری اولاد میں جس کو مجھ کو پدری محبت ہے صرف تمہیں ہو۔ اس کے نام بھی شہلی کے خطوط پڑھیں تو محسوس خاص شفقت کا اظہار نہیں ملتا فاطمہ کے نام شہلی کے تین خط پھیلے ہیں۔ پہلے دو خط تو وہ سقے ہیں جو انھوں نے ”ندوة العلماء“ میں اپنے دفتر سے مکان پر بھیجے۔ ان دونوں فاطمہ خام ”سخت“

اور لکھنؤ بہ غرضِ علاج آئی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے پتہ نہیں کس بات سے متاثر ہو کر باپ سے یہ خیال ظاہر کیا کہ مجھے دو چار دن میں واپس جانے دیجئے اور شاید مولانا نے فوراً اس سے اتفاق کر لیا۔ اس پر بیٹی نے کسی قدر آزدگی کا خط لکھا تو اس کے جواب میں مولانا کہتے ہیں :-

فاطمہ ! نہ میرا پہلے خیال تھا۔ نہ اب ہے کہ تم کو جلد رخصت کر دوں۔ تمہارا علاج سب سے مقدم ہے۔ تم نے خود ہی لکھا تھا کہ مجھ کو دو چار دن میں جانے دیجئے۔ اس پر میں نے لکھ دیا تھا۔

میری طبیعت اب تک اچھی نہیں۔ ورنہ تم سے خود آ کر یہ باتیں کہتا۔ دوسرا رقعہ اس سے ایک ہفتہ بعد کا ہے :-

عزیزی ! گھبراؤ نہیں۔ فاطمہ ! میں کیا تاؤں، میرے دل کو کیا قلق ہے۔ خیر ایسے خیالات دل میں نہ لاؤ۔ تمہاری بیماری تکلیف دہ ہے لیکن ہلک نہیں۔

افسوس کہ مولانا کی تسلیاں طفل تسلیاں ثابت ہوئیں۔ کیونکہ مریضہ کی حالت اصلاح پذیر نہ ہوئی اور وہ بندول چلی گئی۔ اگلے مہینے مولانا نے بھی بمبئی کا رخ کیا۔ ان کا تیسرا خط اس وقت لکھا گیا جب وہ جنحیرہ میں مقیم تھے اور عطیہ بیگم کی ہمیشہ زہرہ ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس خط میں بیٹی کی بیماری پر افسوس کا اظہار کر کے لکھتے ہیں :-

لے شاید حالتِ بیماری میں ہی اپنی بیٹی کو جلد واپس بھیجے پر مولانا اس لئے آمادہ ہو گئے کہ ان دنوں عطیہ بیگم صاحبہ سے شرفِ ملاقات کے لئے وہ جنحیرہ جانے کے لئے بیتاب تھے بیٹی کے نام ان کا یہ رقعہ ۲۹ جولائی کا ہے اس سے چار روز پہلے عطیہ بیگم کو ایک خط لکھ چکے تھے۔ ”زبانی شکر یہ جنحیرہ آ کر ادا کروں گا“

خدا نے چاہا تو لکھنؤ پہنچ کر سب سے پہلے بندول آؤں گا۔ ابھی چند روز اور سفر میں گزر رہے ہیں۔

یہ خط ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء کا ہے۔ پتہ نہیں جس وقت مولانا سفر سے واپس آئے۔ اس وقت تک فاطمہ خانم زندہ تھیں اور باپ بیٹی کی اس کے بعد ملاقات ہو سکی یا نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ باپ کی اس لاڈلی سے اسی سال دنیا کو خیر باد کہا۔ اور اُس کی وفات کے وقت مولانا اس کے پاس موجود نہ تھے۔

شبلی کے خطوں سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اہل و عیال کو ایک جگہ جمع کر رہے تھے۔ اپنی دوسری شادی کے دو سال بعد نواب حبیب الرحمن شروانی کو اپنی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

زنانہ کا الگ بکھڑا ہے۔

لیکن اس سے بھی زوردار اظہار امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی اہلیہ محترمہ کے متعلق ہے۔ ایک خط میں مولوی عبدالباری ندوی کو لکھتے ہیں:-
آزاد کا (کیا) ٹھکانہ۔ وہ کشمیر جائیں تو زنانہ کو کیا کریں۔ یہ بلّا ان کے

ساتھ ہے۔

شاید بعض لوگوں کو مولانا کا یہ طرزِ کلام سرد مہری، بلکہ بے مہری کا اظہار معلوم ہو اور اس میں بھی کلام نہیں کہ سوائے مولوی محمد اسحق کے جو صوّتِ قوتِ دست و دلِ شبلی نعمانی تھا

۱۔ سید سلیمان نے فاطمہ خانم کی وفات کا مہینہ نہیں دیا۔ صرف سال (۱۹۰۹) لکھا ہے صفحہ ۷۲۵ ۷۲۶ حیاتِ شبلی ص ۷۷۸

شبلی کا اقارب و اعزہ سے کسی خاص مہر و محبت کا سلوک نہ تھا لیکن ان کے اس طرزِ عمل میں بھی ایک رمز و حکمت پنہاں تھی۔ مولانا شبلی سمجھتے تھے کہ اہل و عیال کی ذمہ داریوں سے قومی کاموں کی بجا آوری میں خلل پڑتا ہے وہ ایک خط میں عطیہ یکم کو لکھتے ہیں :-

خاندان سے زیادہ ترجیح دینی کوئی مفید چیز نہیں۔ مہاتِ امور رک جاتے ہیں۔

شبلی نے اولاد سے جو سرد مہری برنی۔ یا زنا نہ کے لئے بکھٹرا اور بلا کے الفاظ استعمال کئے۔ اس پر ممکن ہے۔ ان کے اہل و عیال کو شکایت کا حق ہو لیکن کم از کم قوم کو جس کے لئے وہ خاندانی دلچسپیاں پس پشت ڈال رہے تھے۔ کسی شکایت کا حق نہیں بلکہ اس سے تو شبلی کے ایشار اور انہماک کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

اپنے والد سے خفا ہو کر چلے جانے کے بعد حامد صاحب اوائل مئی ۱۹۰۷ء میں بہار شریف سے واپس آئے لیکن اس دوران میں شبلی کے نکاح کی تاریخ آئی اور چلی گئی۔ لڑکی والوں کے ہاں ان کے مہمان وغیرہ آئے ہوئے تھے اور منتظر تھے کہ نکاح کی تاریخ کو برات آئے گی۔ عظم گڑھ میں بھی لوگ مولانا سے کہتے تھے کہ نکاح کی تاریخ نہیں ٹالنی چاہئے لیکن ان کی طبیعت اس وقت اپنے قابو میں نہ تھی۔ وہ نہ مانے۔ اور تاریخ معینہ پر کوئی برات نہ گئی۔ لڑکی والوں کی، بقول شبلی ”بہت مسکمی ہوئی“ لیکن لڑکی کے بھائی مولانا محمد سمیع، مولانا کے چچن کے دوست، بلکہ عاشقِ زار تھے۔ انھوں نے بات کو بگڑنے نہ دیا۔ وہ اعظم گڑھ آئے۔ اور اس بات پر بھی راضی ہو گئے کہ اعظم گڑھ میں ہی نکاح ہو جائے۔

لیکن شبلی اس کے لئے بھی تیار نہ تھے۔ البتہ یہ کہہ کر زیور اور کپڑا بیچ دیا کہ بدبیت ٹھہرنے کے عقد ہو جائے گا۔

حامد شبلی واپس آئے تو نکاح کی تیاری شروع ہوئی اور اگلے مہینے جون ۱۹ء میں یہ فریضہ ادا ہوا۔

مولانا کی شادی خانہ آبادی ان مزارحتوں کے بعد سرانجام پائی لیکن معلوم ہوتا ہے خانہ دل بدستور غیر آباد رہا۔ ان کی خواہش تھی کہ جو آئے سیرت اور صورت دونوں میں بے نظیر ہو لیکن یہ ارمان پورے نہ ہوئے۔ چنانچہ اب انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ کم از کم بیوی کو تعلیم دے کر اس کے حسن سیرت کا انتظام کیا جائے۔ یہ اہتمام ان کی بیٹی کے سپرد ہوا اور ساتھ ہی مولانا نے دواہن کے بھائی، مولوی محمد سمیع کو ایک پڑ مردگی سے بھرا ہوا خط لکھا:

تم جانتے ہو کہ حسن صورت کی نوبت ہو چکی۔ میری قسمت میں دونوں کا اجتماع نہ تھا۔ اب کوئی چیز مایہ تسکین ہو سکتی ہے تو مرثیہ حسن سیرت ہے۔ اس کے لئے

۱۔ ملاحظہ ہو۔ حیات شبلی ص ۲۵ وغیرہ۔ پتہ نہیں۔ مولوی محمد امین زبیری، خطوط شبلی (طبع ثانی) کے دیباچہ میں کس بنا پر کہتے ہیں۔ ”بیوی کے انتقال کے بعد انہی جگر بندوں کے خون سے انہوں نے عقد ثانی نہیں کیا اور جب بزرگوں اور دوستوں کے مجبور کرنے پر راضی ہوئے تو خاندان کی قید کو توڑ کر مولانا محمد علی مرحوم ناظم مدرہ نے اپنے ایک ہم سبق درد ست کی لڑکی تجویز کی جس کو خدائے صمدی و مثنوی خوبیاں عطا کی تھیں اور جس نے فارسی کی اچھی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن مولانا ہی کے احباب میں ایک فی ثروت اور ذی مرتبت و دست اس جنس نفیس کے خریدار بن گئے اور مولانا نے عقد ثانی کا خیال ہی چھوڑ دیا۔“ یہ واقعہ یا تو دوسری بیوی کی وفات کے بعد رونما ہوا ہو گا جو ۱۹۰۵ء میں چل بسیں یا عقد ثانی سے پہلے لیکن عقد ثانی ضرور ہوا۔

سب سے مقدم تعلیم ہے۔

شادی کتختائی سے فارغ ہو کر مولانا علی کاموں میں ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے کہ ان پر ایک اور مصیبت آئی۔ اب ان کے والد شیخ حبیب اللہ کی عمر زیادہ ہو رہی تھی۔ صدمے بھی انھوں نے بہت سہے تھے۔ بالخصوص لائق کو جوان بیٹے مہدی کی جس سے ان کی سب امیدیں وابستہ تھیں۔ وفات نے انھیں بہت دھکا لگایا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ وہ طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوئے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے آخر میں وہ پھر بیمار ہوئے۔ نو مہینوں کی حالت بہت خراب ہوئی اور بالآخر وہ ۱۲ نومبر ۱۹۰۷ء کو وفات پا گئے۔

شبلی کو والد کی وفات کا بڑا صدمہ تھا۔ چنانچہ اس موقع پر انھوں نے ایک فارسی مرثیہ لکھا جو اگرچہ کسی وجہ سے دیوان مرتب کرتے وقت شامل دیوان نہیں ہوا لیکن جواب برگ گل میں چھپ گیا ہے۔ والد کی زندگی میں شبلی کو ان کے ساتھ کئی غلط فہمیاں اور بعض حقیقی اختلافات رہے تھے لیکن ان کی وفات پر شبلی نے بڑی ہمت اور صحیح فرزندانہ سعادت سے کام لیا۔ ان کے والد نے تھوڑی نقدی اور بہت سا قرض چھوڑا تھا اور جائیداد کا جزو غالب شبلی کی موتی ماں کے نام منتقل کر دیا تھا۔ جب شیخ حبیب اللہ نے یہ جائیداد اپنی دوسری بیوی کو منتقل کی تھی تو بہ امر شبلی کو بہت ناگوار گزرا تھا اور جب ۱۸۹۲ء میں

۱۸۹۲ء میں سید سلیمان نے شبلی کے فارسی دیوان کی نسبت ایک خط کی بنیاد لکھا ہے کہ یہ ۱۸۹۲ء میں طبع ہوا لیکن نامی پریس والے دیوان میں ۱۹۰۷ء کا ترکیب بند بھی ہے۔ اور سرورق پر شبلی کو ”ناظم سررشتہ معلوم وغیرہ“ بتایا گیا ہے لیکن تاریخ نہیں ہلا خیال ہے۔ کہ یہ دیوان ۱۹۰۷ء سے پہلے نہیں شائع ہوا۔

کوشش ہوئی کہ ایک قرار نامہ کی رو سے معاملہ سدھ جائے تو اگر شبلی کے بھائی مہدی والدہ کے ہم خیال تھے اور دوسرے بھائی مولوی محمد اسحق بھی متفق ہو گئے تھے لیکن شبلی نے اسے قبول نہ کیا وہ اپنے بھائی مولوی محمد اسحق کو اپیل کرنے میں نکتہ پور

..... ہم لوگ اس وقت تک کسی جائداد کے مالک نہیں ہیں۔ کیونکہ والدہ کا حصہ فضول ہے اور تقسیم نامہ اخیر میں ہم لوگوں کو خود کچھ نہیں دیا گیا بلکہ برات عاشقان بر شام آہو...

اصل یہ ہے کہ اگر والد قبلہ کو اور زیادہ ترکانوں میں لکھا نا ہے تو وہ جس قدر چاہیں لکھائیں لیکن اگر صفائی سے کوئی معاملہ کرنا ہے تو اس کی صرف یہ تدبیر ہے کہ جس قدر حصہ زائد فریق سوم کو دیا گیا ہے وہ بذریعہ بیع کے فریق دوم کی طرف رجوع کرے اور فریق دوم کا اصلی حصہ بذریعہ ہبہ نامہ منتقل۔ منتقل کیا جائے اس کے سوا اور سب تدبیریں سبزاغ ہیں جس کو میں بہت کچھ دیکھ چکا ہوں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ یہ تدبیر نہ والد قبلہ کو منظور ہے۔ نہ ارباب چھاؤنی کو اور سب سے زیادہ میاں مہدی کو لیکن یہ حالت ہے تو نمائش سے کیا فائدہ ہو چکا۔ ہو چکا فریق دوم کچھ نمائش فریاد نہیں کرتا۔ بے فائدہ فکر کیوں کی جاتی ہے۔

شیخ حبیب اللہ کی وفات کے بعد ان کی اولاد کو قرضے کی رقم اور ان مناسبت کا، جو نکاح ثانی کا عام مقررہ ہیں، سامنا کرنا پڑا لیکن خلی کی ہمت اور دہشت اور ان کی سوتیلی والدہ کی شرافت اور دریادلی سے سب مشکلات حل ہو گئیں۔ ”باپ کی زندگی بھر سولانا سوتیلی ماں سے ملنا کیا معنی نام سے بیزارتھے ان کا ذکر سننا نہیں چاہتے تھے مگر باپ کی وفات کے بعد یہ انقلاب ہوا کہ وہ خود چھاؤنی میں جہاں وہ رہتے تھے۔ تشریف لے گئے۔ ماں کے قدموں پر

گرے۔ عمر بھر کی معافی مانگی اور ایسی سعادتمندی دکھائی کہ اپنے بیٹے سے بھی ممکن نہیں۔ مولانا کی والدہ نے مولانا کا حسن سلوک دیکھ کر جو کیا وہ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ انھوں نے وہ جائیداد جو انھیں شیخ صاحب ہبہ کر گئے تھے واپس کر دی۔ یہ جائیداد قرضخواہوں کو دے دی گئی اور قرض کا جزو غالب ادا ہوا جو کچھ باقی رہ گیا تھا اسے مولانا نے حیدر آباد کی ملازمت میں بیاق کر دیا۔

علی گڑھ چھوڑنے کے دو تین سال بعد تک شبلی نہ صرف ذاتی اور خانہ مشکلات میں مبتلا رہے بلکہ علی حیثیت سے بھی کچھ نہ کر سکے۔ علی گڑھ چھوڑ کر ان کا ارادہ ندوہ میں قیام کا تھا اور علالت کے دوران میں وہ کچھ زمانہ ندوہ کے مکان میں مقیم رہے لیکن وہاں انھوں نے دیکھا کہ ان کے اور ندوہ کے ارباب حل و عقد کے نقطہ نظر میں بڑا فرق ہے۔ ۱۸۹۶ء میں انھوں نے دارالعلوم میں انگریزی پڑھائے جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ منظور نہ ہوئی اس علادہ ندوہ پر کچھ اس طرح کا زمانہ آیا ہوا تھا کہ شبلی جو بڑے ذکی و احساس ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے محتاط بھی تھے۔ اس امر کو خلاف مصلحت سمجھتے تھے کہ وہ اس زمانے میں اپنے آپ کو ندوہ سے وابستہ کریں، اس وقت صوبجات متحدہ کے گورنر سرائٹونی میکڈانلڈ اور تھے۔ انھیں مسلمانوں اور اسلامی اداروں سے ویسے ہی غیر معمولی دلچسپی تھی اور ندوہ پر خاص تکیہ کر کے اس سبب یہ ہوا کہ ندوہ کے کسی مسلمان مخالف نے ان تک ندوہ کی سیاسی روش کے خلاف شکایتیں پہنچا دیں چنانچہ ندوہ کی طرف سے بدگمانی کا آغاز ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کے بڑے بڑے ارکان نے صوبہ بلکہ برطانوی ہندوستان کو چھوڑ دیا۔ منشی اطہر علی صاحب مرحوم حیدر آباد چلے گئے۔ ندوہ کے ناظم اور روح رواں مولانا سید محمد علی صاحب بھی ۱۹۰۱ء میں

محاذ تشریف لے گئے اور ان کی جگہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی دہلوی قائم مقام ہوئے۔ مگر انھوں نے قیام دہلی ہی میں رکھا پھر بعد کو وہ بھی ایک ہی سال کے اندر مستعفی ہو گئے۔

مولانا شبلی نے ابھی ندوہ میں قیام نہیں کیا تھا بلکہ وہ دواخری سالانہ جلسوں میں بھی شریک نہ ہوئے تھے لیکن وہ ندوہ کے رکن رکین گئے تھے۔ قرین قیاس ہے کہ ان کی طرف بھی ارباب حل و عقد کی مشتبہ نظر مل سکتی ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے بھی برطانوی ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ”فروری ۱۹۰۱ء میں دفعتاً وہ اعظم گڑھ سے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے یونہی غازی پور کا ٹکٹ لیا۔ وہاں سے علی گڑھ کا رخ کیا اور نواب محسن الملک سے مشورے کے بعد حیدر آباد روانہ ہو گئے۔“

حیدر آباد پہنچ کر مولانا پہلے مولوی عزیز مرزا کے ہاں مقیم ہوئے جو وہاں ہوم سکریٹری تھے۔ پھر مولوی سید علی بلگرامی کے ہاں اسٹھ گئے۔ حیدر آباد سے مولانا کے تعلقات پُرانے تھے۔ ان کی آمد پر علم و ادب کے حلقوں میں بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اپریل ۱۹۰۱ء کو ان کے لئے صیغہ امور مذہبی کا ایک عہدہ جس کا ماہوار مشاہرہ ۲۵ روپے تھا تجویز ہوا لیکن مولانا نے اسے قبول نہ کیا اور بالآخر ۲۲ مئی ۱۹۰۱ء کو ان کا تقرر سررشتہ علوم و فنون کی نظامت پر ہوا۔ اس محکمہ کا مقصد اردو زبان میں بذریعہ تصنیف و تالیف و ترجمہ علمی کتب کا ذخیرہ بہم پہنچانا تھا۔ مولوی سید علی بلگرامی اس سررشتہ کے مگر ان تھے اور ان ہی نے مولانا کا انتخاب کیا اس تقرر کی وجہ سے نہ صرف مولانا کی مالی مشکلات کا بار ہلکا ہو گیا بلکہ انھیں تصنیف و تالیف کا بھی اچھا موقع ملتا رہا اور ساڑھے تین سال

کے قیام میں انھوں نے کوئی پانچ کتابیں مکمل کیں۔
 علی گڑھ آنے سے پہلے شبلی کی علمی کوششیں شرگوئی اور مناظرانہ رسالوں
 تک محدود تھیں۔ وہاں پہنچ کر انھیں علم تاریخ کا شوق پیدا ہوا اور ان
 کی تاریخی اور سوانحی تصانیف کا جزو غالب وہیں لکھا گیا۔ مسلمانوں کی
 گزشتہ تعلیم اور دوسرے تاریخی رسائل کے علاوہ المامون۔ النعمان
 قیام علی گڑھ کے دوران میں شائع ہوئیں اور الفاروق بھی قریب قریب
 ساری کی ساری اسی زمانے میں مکمل ہوئی۔

حیدر آباد پہنچ کر مولانا کا تصنیفی محور پھر بدل گیا۔ یہاں زیادہ تر کلامی
 کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں ایک تو علم الکلام کی تاریخ (علم الکلام ادا
 دوسری (الکلام) جدید علم کلام کے متعلق ہے۔ مولانا پر اس زمانے میں
 یہ رنگ غالب تھا کہ انھوں نے غزالی اور رومی کی سوانح عمریوں (الغزالی
 اور سوانح مولانا روم) کو بھی علم الکلام کی کتابیں بنا دیا اور ان میں زیادہ
 کلامی مباحث سے بحث کی۔ الغزالی سرسید کے ایما پر شروع ہوئی۔ وہ
 الفاروق لکھے جانے کے حق میں نہ تھے۔ انھیں اٹھارویں صدی اور
 شاہان اودھ کا وہ زمانہ یاد تھا جب شیعہ مسئلے نے قوم کا اجتماعی نظام
 درہم برہم کر دیا تھا۔ انھوں بڑی مشکل سے دونوں فریقوں کو اپنی خوشی
 سے مل کر کام کرنے کا طریقہ بتایا تھا اور وہ ہر ایسی چیز سے ڈرتے تھے۔
 جس سے پرانی تلخ بحثیں تازہ ہونے کا امکان ہو۔ وہ ابھی الفاروق اور
 اعلیٰ لکھے جانے کے حق میں نہ تھے اور انھوں نے شبلی کو الفاروق کے بجائے
 الغزالی لکھنے کا مشورہ دیا۔ شبلی نے اس وقت تو یہ مشورہ قبول نہ کیا۔ لیکن
 حبل الفاروق سے فاسد ہوئے تو الغزالی لکھنے کا خیال آیا۔ اس وقت ان

کلامی اور معتزلی رنگ چھایا ہوا تھا چنانچہ انھوں نے الغزالی کو بھی اپنے کلامی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مولانا شبلی جہدی حسن کو جسوں نے الغزالی کی تشنگی کی شکایت کی تھی۔ لکھتے ہیں:-

بے شہ غزالی کو بہت کچھ سمیٹا ہے اور اس کے چند در چند اسباب جمع ہو گئے۔ ایک تو دہی کمر

رکھوں کچھ اپنی بھی میں چشمِ خونِ نقشاں کے لئے
دوسرے حیدر آباد میں رہ کر زیادہ پھیلنا ممکن نہ تھا۔ بے شہ یہ اخلاقی کمزوری ہے لیکن ضروریاتِ زندگی چند روز تک یہاں رہنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ دوسرے ایڈیشنوں میں اس کی تلافی کا موقع باقی رہتا ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں علماءِ غیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں اس کے لئے زینے درکار ہیں الغزالی پہلا زینہ ہے دوسرا تاریخِ علمِ الکلام پھر اصل سطح یعنی علمِ کلام جدید ہے جو زیرِ تصنیف ہے۔۔۔۔۔ غزالی میں اگر کھل کھلتا تو علماء برسوں بلکہ قرون کے لئے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو ان سے کٹ کر الگ ہو جانا منظور نہیں بلکہ صر میں تو ڈوب رہوں۔۔۔۔۔

افسوس کہ مولانا نے الغزالی میں اپنے موضوعِ تصنیف کا حق ادا نہیں کیا۔ یوں تو ان کی حیدر آباد کی ساری تصانیف پر ایک بے جان تکلف چھایا ہوا ہے لیکن غزالی اور مولانا روم کی سوانح عمریوں سے خاص طور پر مایوسی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی کو ابتدائی تربیت نے ایک کمزور معقول بنا دیا تھا۔ ان کی تصانیف کی منطقی ترتیب سے انکار نہیں عام معقولیوں کی طرح ان کی ظواہر پر پوری نظر تھی اور ان کی طرزِ تحریر میں

ایک بوج اور نفاست ہے لیکن نظر کی وہ گہرائی باطن کی وہ پاکیزگی۔ دل کی وہ گدازنگی جو دہلی اور دیوبند کے محدثین کا عطیہ تھی۔ ان سے پورب کا یہ معقولی بھرا رہا وہ غزالی میں بھی سب سے پہلے کلامیات کو ڈھونڈتے ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں مولانا شروانی کو تصنیف کے چند موضوع بتائے تھے۔ ان میں ایک امام غزالی کی سوانح عمری تھا۔ لکھتے ہیں :-

امام غزالی کی لائف جس میں علم کلام پر پورا ریویو ہوتا۔ کیونکہ موجودہ علم کلام کے موجودہ ہیں۔

چنانچہ الغزالی میں کلامیات کی بوجھاڑ ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ شروع میں تصوف اور روحانیت جو غزالی کی زندگی کے سب سے اہم اور نمایاں پہلو ہیں۔ ان کا بھی کتاب میں ذکر نہ تھا۔ ”ایک دوست کی توجہ دلانے سے انھوں نے امام ممدوح کی صوفیت کا مطالعہ کر کے ایک باب الغزالی میں اضافہ کیا۔“ اب حالت یہ ہے کہ اگرچہ شبلی کے قلم سے جو کچھ بھی نکلا ہے۔ بیش بہا ہے۔ ان کی ادھوری اور سرسری کوششیں بھی ادبِ اردو کا تاج ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ الغزالی ایک کامیاب سوانح عمری نہیں اور اس سے اردو ان طبقے کو اسلامی تاریخ کی اس عظیم الشان ہستی سے جس کی روحانی کشمکش کا مطالعہ مادیات اور وہابیات کے موجود و ظواہر پسند دور میں خاص طور پر ضروری ہے۔ کما حقہ روشناس ہونے کا موقع نہیں ملا۔

کلامیات سے شغف کے علاوہ قیام حیدر آباد میں مولانا کو خالص ادبی الغزالی سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ہم بکھ چکے ہیں کہ علی گڑھ آنے سے قبل آثارِ روق سے فاکرٹ سے لکھا کرتے تھے۔ علی گڑھ آنے کے بعد ان کی

شاعری کا محور بدل گیا اور غزلوں کی جگہ قومی نظموں نے لے لی۔ وہ حیدر آباد گئے تو جہاں اسلامی تاریخ کی جگہ کلاسیکات کا نشہ طاری ہوا۔ وہاں غزل گو کا پرانا شوق بھی عود کر آیا۔ حیدر آباد میں اس وقت داغ بھر۔ مولوی عزیز مرزا۔ مولوی ظفر علی خاں۔ مولوی عبدالحق اور دوسرے ادب کے دلدادہ موجود تھے۔ داغ سے شبلی کو خاص طور پر عقیدت تھی۔ سید سلیمان کہتے ہیں۔ ”داغ کے سینکڑوں اچھے شعرا کی زبان پر تھے“ چنانچہ اس ماحول میں ان کا ابتدائی ذوق پھر اُبھر آیا اور انھوں نے کئی اردو غزلیں لکھیں۔ انھوں نے یہ غزلیں محفوظ نہیں رہیں لیکن انھوں نے ایک خط میں جو چند شعر درج کئے ہیں۔ ان سے اس زمانے کے رنگِ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اثر کے پیچھے دلِ حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا
گئے ہیں نالے جو سوئے گردوں تو اشک نے رُخ کیا زین کا
وہی لڑکپن کی شوخیاں ہیں وہ اگلی ہی سی شرارتیں ہیں
سیانے ہوں گے تو ”ہاں“ بھی ہوگی ابھی تو ”نہیں“ نہیں کا
یہ نظم آئیں یہ طرزِ بندش، سخنوری کیا فسوں گری ہے

کدریختہ میں بھی تیرے شبلی مزہ ہے طرزِ علی حزیں کا
موازنہ انیس و دہیر کا بیج بھی ان ہی ادبی صحبتوں میں بویا گیا اور بمبئی سے
نعلیق کا آغاز بھی جو شبلی کی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے والا تھا۔
قیام حیدر آباد کے دوران میں ہوا۔ وہ حیدر آباد آتے جاتے یا حیدر آباد سے
آکر گاہے گاہے بمبئی دیکھتے ہوں گے اور یہاں کے دیدہ افروز مناظر سے
متاثر ہوتے ہوں گے۔ مثلاً جب ۱۹۰۲ء میں آرنلڈ صاحب ہندوستان چھوڑ کر

ولایت گئے۔ تو انھیں الوداع کہنے مولانا بمبئی آئے تھے اور ایک تحفہ بھی ساتھ لائے تھے۔

ادب اور بالخصوص اردو ادب سے ان دنوں شبلی کی دلچسپی بڑھ جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ اس وقت انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ یہ انجمن فی الحقیقت ان کوششوں کا نتیجہ تھی جو نواب محسن الملک اور دوسرے حامیان اردو، سرانٹونی میکڈانل اور ہندی پسند ہندوؤں کے حملوں سے اردو کو بچانے کے لئے کر رہے تھے۔ اپریل ۱۹۰۷ء میں جب یو۔ پی۔ میں ایک ایسا فرمان جاری ہوا جسے اردو کے حامیوں نے اپنی زبان کیلئے سخت منفر سمجھا تو نواب محسن الملک نے اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی اور اس سلسلے میں لکھنؤ میں ایک زبردست تقریر کی۔ سرانٹونی میکڈانل کا شدید مخالفت سے یہ کوششیں تو سرسبز نہ ہوئیں لیکن جب میکڈانل صاحب چلے گئے اور حالات زیادہ سازگار ہوئے تو نواب محسن الملک نے اردو کی ترقی کے لئے پھر ایک ادارہ قائم کرنا چاہا اور ۱۹۰۸ء کے شروع میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک صیغے کے طور پر انجمن ترقی اردو کا آغاز ہوا۔

جن لوگوں نے گذشتہ بیس پچیس سال میں، بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے زیرِ عنان، انجمن کی کارگزاریاں دیکھی ہیں جیفیوں نے انجمن کو ایک اچھی خاصی حکومت کا ایک سرگرم صیغہ بنا دیا ہے اور اس کے گزرے زمانے میں بھی دکھا دیا ہے کہ وہ کون سی انتظامی قابلیت۔ عملی سوچ بوجھ اور بلند ہمتی تھی جس کی بدولت مسلمانوں نے کئی سو سال اس ملک میں حکومت کی تھی۔ انھیں تو مولانا شبلی کا ابتدائی کام بالکل معمولی نظر آئے گا۔ لیکن وہ کام کا آغاز تھا اور شبلی نے ایک دو سال کی نظامت میں جو کچھ

کیا وہ ان کی خوش تدبیری اور اردو سے محبت کا ایک چھانمونا ہے۔
 ظاہری حیثیت سے حیدرآباد میں شبلی کی حالت بہت اچھی تھی۔ علی گڑھ
 میں انھیں سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ یہاں چار سو۔ تصنیف و تالیف کے
 لئے بھی وقت تھا۔ صحبت بھی بالکمال اور بامذاق لوگوں کی تھی لیکن شبلی کے
 خطوط پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک سخت ذہنی خلفشار اور کشمکش کی وجہ سے
 وہ ایک کانٹوں کی سیج پر لوٹے رہے۔ اس میں کسی حد تک تو ان کے مزاج کو
 دخل تھا جو اعصابی کمزوری اور طبعی سوداویت کی وجہ سے اب آہستہ آہستہ زیادہ
 چڑچڑا ہو رہا تھا لیکن حیدرآباد کے حالات بھی کچھ ایسے تھے کہ شبلی کو سکون ملنا
 محال تھا۔

جس وقت حیدرآباد میں ان کی ملازمت کا معاملہ درپیش تھا۔ اس وقت
 بھی وہ ایک دماغی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان کی طبیعت اور علمی ذوق کا تقاضا
 تھا کہ وہ ملازمت کی زنجیروں میں نہ پھنسیں اور دنیوی حالات اس تعلق
 پر مجبور نہ رہے تھے۔ ۷ اپریل کا ایک خط ہے :-

میں نے یہ غم کر لیا ہے کہ کوئی معقول بات نکل آئے۔ تو خیر۔ ورنہ دنیاوی
 خواہشوں سے صاف دست بردار ہونا ہے۔

اس کے چند روز بعد جب ابھی ان کی ملازمت کا فیصلہ نہ ہوا تھا۔
 اپنے سارے کو لکھتے ہیں :-

بہر حال دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ بے شبہ اگر ملازمت کر سکتا اور کسی قدر دنیاوی
 بھی مجھ سے بن پڑتی تو دنیاوی فائدے بہت حاصل ہوتے لیکن یہاں سمیع
 عمر کا بڑا حصہ صرف ہو چکا۔ چند برسوں کے لئے دامن زندگی کو کیا آلودہ کروں
 دماغ کو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی۔ بلند ہی رہے ۹

اس کے چند روز بعد انھوں نے اپنے عہدے کا چارج لیا۔ لیکن وہی کشمکش اب بھی قائم رہی۔ فرماتے ہیں :-
 میں یہاں آکر ایسا پھنس گیا کہ

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

ہمت کہتی ہے۔ عہدے تامل آستیں افتادن از دنیا خوش است
 مصلحت فریب دیتی ہے کہ تم میں اور بہت سے لوگ شامل ہیں ان کا بھی
 لحاظ رکھنا چاہئے۔ اس کے بعد واقعات ایسے آئے جنہوں نے ان کے سکون و اطمینان
 کو اور درہم برہم کر دیا۔ شبلی کو ملازمت مولوی سید علی بلگرامی کی مدد اور مدارالمہامی (نواب
 وقار الہامی) کی عنایت سے حاصل ہوئی تھی لیکن ریاستوں کا معاملہ عجیب ہوتا ہے اس
 ملازمت کی تفویض کے چند ماہ بعد نواب وقار الہامی مدارالمہامی سے مستعفی ہو گئے اور
 مولوی سید علی بلگرامی کو ریاست نے سبکدوش کر دیا۔ شبلی ان کے متوسلین میں سے
 تھے ان کی ملازمت بھی معرض خطر میں پڑ گئی۔ ۲۷ اگست کو شروانی کو لکھتے ہیں :-

”حیدر آباد کی پولیشل سرزمین میں سخت بھونچال آیا۔ وزارت کا قبلہ مشرق سے
 مغرب کو بدل گیا..... ہاں میں نے نظامت علوم و فنون قبول تو کر لی ہے
 لیکن اس انقلاب میں دیکھئے۔ یہ خدمت بھی مجھے قبول کرتی ہے یا نہیں۔ چند
 روز بعد کا خط ہے۔“

انقلاب حال نے تمام امیدیں خاک میں ملا دیں۔ اب ایام گزاری ہے۔
 پھر..... اکتوبر کو ان ہی کو لکھتے ہیں :-

یہاں ہر روز ایک نیا تگوفہ کھلتا ہے۔ سید علی محل چکے اور لوگ نکالے
 جاتے ہیں۔ میرا بھی نفس باز پس ہے۔

اسی زمانے کا سمیع صاحب کے نام خط ہے :-

یہاں کے حالات غالباً تم نے اخباروں میں پڑھے ہوں گے۔ محقر یہ کہ دنیا
ادھر کی ادھر ہو گئی۔ مولوی سید علی وغیرہ نکلے اور بقیہ نکلنے جاتے ہیں۔ میں
بھی دو چار روز کا یہاں ہوں۔

شبلی نے دینی ترقی کے جو خواب دیکھے تھے۔ انھیں وزارت کے انقلاب
نے درہم برہم کر دیا۔ لیکن شبلی کے دوسری پارٹی سے بھی تعلقات تھے اور نواب
وقار الامرا کے جانشین مہاراجہ کشن پرشاد ان کے قدر دان تھے۔ ان کی ملازمت
قائم رہی۔ البتہ اس کی ضرورت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک کمیشن بٹھا دیا گیا۔
مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں :-

میں اچھا ہوں۔ مگر پریشان ہوں۔ یہاں برسوں میں ایک چیز کا فیصلہ ہوتا
ہے۔ میرے سررشتہ اور دائرۃ المعارف پر ایک کمیشن بٹھا ہے۔ اس کی
رپورٹ پر فیصلہ ہوگا لیکن پہلے بھی یہاں کی سازشوں سے سخت گھبرا
گیا ہوں۔

چند روز بعد کا ایک خط ہے :-

میرے حالات اب یہاں بہت خراب ہیں۔
اس کشمکش نے مولانا کو سخت بد دل کر دیا اور ندوہ کے قیام کا ارادہ
اور مضبوط ہو گیا۔ چنانچہ اس دوران میں مولانا نے ندوہ کے سالانہ جلسے
میں باقاعدہ اعلان کروادیا کہ وہ ندوہ میں شریک ہو جائیں گے لیکن اس کے
بعد ان کے حیدر آباد میں حالات بہتر ہو گئے اور وہ سوچنے لگے کہ اگر ہو سکے
تو حیدر آباد میں ہی بیٹھ کر ندوہ کی خدمت کی جائے۔ وہ مولانا حبیب الرحمن
شروانی، کو جو ان کے حیدر آباد چھوڑنے اور ندوہ آنے پر مقرر تھے۔ ایک خط
میں لکھتے ہیں :-

ندوہ میں جو لوگ میرے خلاف ہیں۔ ان میں خود میرے ہم وطن اور عزیز بھی ہیں جس وجہ سے خلاف ہیں۔ اس سے بھی میں واقف ہوں۔ لیکن ان باتوں کی طرف توجہ کرنے سے لیا حاصل۔ آپ سے البتہ تعجب ہے کہ ہر قسم کے کام کرنے کے لئے ترکِ معاش کی شرط کو ضروری قرار دیں۔

یہ خط ستمبر ۱۸۸۲ء کا ہے۔ اس کے بعد خطوط میں حیدر آباد چھوڑ کر ندوہ جانے کا ذکر بہت کم ہے مولانا کی نسبت کمیشن نے فیصلہ کیا تھا کہ ان کا محکمہ نوآباد دیا جائے لیکن پھر یہ معاملہ گونسل میں گیا اور مدارِ المہام مولانا کے حیدر آباد رہنے کے حق میں تھے۔ مولانا اس کشمکش میں تھے کہ انھوں نے اخبارات میں کسی ہندو انجمن (سروٹس آف انڈیا سوسائٹی؟) کی تاسیس اور ہندوؤں کے ایثار کا حال پڑھا۔ اس سے ان کے دلوں پر پھر تازہ ہو گئے اور انھوں نے ۱۹۰۲ء میں کوشش شروع کی کہ ان کا پُرانا تصنیفی وظیفہ جاری ہو جائے اور موجودہ ملازمت سے استعفیٰ قبول ہو۔ ستمبر ۱۹۰۳ء میں وہ حالات کو بہتر خود دیکھنے کے لئے لکھنؤ گئے اور ندوہ میں چند روز کے قیام کے بعد قطعی فیصلہ کیا کہ حیدر آباد چھوڑ دیں۔ اور ندوہ میں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء کے شروع میں انھوں نے حیدر آباد کو خیر باد کہا۔ اور ندوہ میں اقامت اختیار کی :

ندوۃ العلوم لکھنؤ

(۱)

۱۹۰۵ — ۱۹۰۸

مولانا شبلی ندوہ میں ۱۹۰۵ء کے شروع میں آئے۔ لیکن ندوہ کے نصابِ تعلیم کی ترمیم اور ندوہ کی عام اصلاح کے متعلق ان کی کوششیں حیدرآباد سے ہی جاری تھیں۔ وہ ۱۸۹۹ء، ۱۹۰۰ء، ۱۹۰۱ء کے سالانہ جلسوں میں شامل نہ ہوئے تھے اور ندوہ سے دور رہنے میں گورنر کے سیاسی، شبہات کو بھی دخل تھا۔ لیکن اس مشکل کو نواب محسن الملک نے حل کر دیا۔ وہ اگست ۱۹۰۲ء میں گورنر سے ملے شبلی کے متعلق اس کے تمام شبہات رفع کئے اور گورنر سے مشورے کے بعد مولانا کو لکھا کہ آپ علی گڑھ آجلیے۔ کالج سے بھی سو روپے ملیں گے۔ حیدرآباد کا وظیفہ بھی جاری ہو جائے گا۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا۔ جب شبلی نے حیاتِ جاوید کے خلاف نئی خطوط میں نہایت جلع کئے فقرے لکھے تھے اور ان کے دل میں سرسید اور علی گڑھ کے خلاف ایک طرح کا ردِ عمل شروع تھا انھوں نے فیصلہ کیا کہ علی گڑھ کے بجائے ندوہ میں شریک ہوں۔

اس سال وہ ایک مدت کے بعد ندوہ کے سالانہ جلسے میں شریک ہوئے اور امرتسر میں وہ فارسی ترکیب بند پڑھا جسے ندوہ کا ”منشور انتخابی“ سمجھنا چاہئے۔ اس سے کئی سال پہلے انھوں نے ندوہ کے ایک ابتدائی جلسے میں ”علما کے فرائض“ (یا حقوق؟) پر ایک طویل تقریر کی تھی۔

جس میں ندوۃ العلماء کے متعلق ان کے خواب بیان ہوئے تھے لیکن اس میں تعلیم کے قدیم اور جدید طریقوں پر طنز نہ تھا۔ امرتسر کے ترکیب بند میں دونوں پر اعتراضات ہیں اور ندوہ کی فوقیت بتائی گئی ہے جو ان دونوں کو طمانا چاہتا تھا۔ شروع میں تعلیم قدیم کا ذکر ہے اور چونکہ شبلی اس راہ کی تمغیاں خود اٹھا چکے تھے۔ ان کا ذکر بڑے موثر طریقے سے ہے۔

درجین حادثہ صعب کہ برما افتاد چارہ آں نیست کہ بر رسم کہن طرح نہی
ماچہ سودت دہد آں شیوہ تعلیم قدیم
ایں نہ خواری بود آخر کہ پس کسب علوم
عامیاں را بقریبی و بہ صد حیلہ و فن
یا کہ باہم جو خودے بحث و جدل سازدی
دست بالا است ہر آئینہ زیریں بہتر
نہ بود وجہ کفایت تو مگر ہدیہ و نذر

خود بفرمائے اگر میں مشغلہ مقصود چہ بود ؟

گر وجود تو زیاں نیست بگو سود چہ بود ؟

اس کے بعد نئی تعلیم والوں سے خطاب ہے۔

لے کہ برآمدہ یورپ میہاں باشی جیف باشد اگر از جملہ ایشاں باشی
جیف اگر از اثر فلسفہ مغربیاں
سمرا شعبہ جلوہ دہد سر نہی
گفتہ سولن و آئین جہانانی او
از ہنیال صد افسانہ و دستان گوئی
جیف باشد اگر از جملہ ایشاں باشی
منکر فلسفہ سنت و قرآن باشی
منکر معجزہ موسیٰ عمراں باشی
برزبان داری و بیگانہ ز نعمان باشی
جاہل از معرکہ ہائے شہ مرداں باشی

قیصر را ہمہ یک یک بشماری آغاز بے خراز عمر وحید و عثمانی باشی
پھر ندوہ کا ذکر ہے

دین و دنیا ہم آمیختن آسان بود گویا کشتی و گرداب دوچار افتادہست
نسبت فلسفہ و شرع بدای می ماند کہ خزاں در عقب باد بہار افتادہست
حل این مشکل گر خواہی از ندوہ بخواہ او کشاید گر ہے را کہ بکار افتادہست
حکمت و شرع در اینجا ہم آمیختہ اند نمک و یادہ - دریں میکہ بار افتادہست
عقل را نیست سرعربہ این جا با نقل پنبہ را آشتی اینجا بہ شرار افتادہست
پتہ نہیں علی گڑھ اور دیوبند میں اس شاعرانہ طرز بیان کی نسبت
کیا کہا گیا لیکن شیریں خواہوں اور زورِ انشا سے واقعات نہیں بدل
جاتے حقیقت یہ تھی کہ ندوہ خود ایک قدیم طرز کا مدرسہ تھا - مولانا نے
قدیم طرزِ تعلیم پر جو اعتراض کئے تھے - ان کا جواب سب سے پہلے یہیں
دیا گیا اور وہ بھی مولانا کے قدیم استاد مولانا محمد فاروق چریا کوٹی
کی طرف سے !

سید سلیمان حیاتِ شبلی میں لکھتے ہیں :-

مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی اس وقت دارالعلوم میں مدرس علی
تھے وہ بھی امرتسر تشریف لے گئے تھے وہ واپس آئے تو شاگرد (مولانا
شبلی) کے اس ترکیب بند کے ان چند شعروں سے بہت خفا تھے -
جن میں فلسفہ قدیم پر اور علما کی جدید فلسفہ سے بے خبری پر تعرض تھی -
تاچہ سودت دہداں فلسفہ ہمد قدیم تاچہ سوژد دہداں ہیئت پارہ نہاد
از عناصرہ و شصت آہ ایک بہ شمار تو ہماں در گرد آتش و آہستی باد
ہم لوگ اس وقت مولانا فاروق صاحب سے فلسفہ و منطق کی بحث

چھوٹی کتابیں پڑھتے تھے۔ پھر بھی وہ ہم لوگوں کے سامنے بڑے جوش سے ان ۶۳ عناصر کے نظریہ کی تردید کرتے تھے اور سمجھاتے تھے۔ اور خیال آتا ہے کہ اس کے جواب میں چند شعر بھی کہے تھے۔

شبلی سے مولانا فاروق کا اختلاف بڑا دلچسپ ہے۔ اس سے ایک تو اس قدیم پر در ماحول کا اندازہ ہوتا ہے جس میں شبلی کی دماغی ساخت معین ہوئی تھی۔ دوسرے اس فرق کا بھی پتہ چلتا ہے جو علی گڑھ کے قیام سے شبلی کے خیالات میں پیدا ہوا۔ اب شبلی وہی شبلی نہ تھا۔ جو اعظم گڑھ میں مولانا فاروق کے سامنے زانوئے شاگردی نہ کرتا تھا بلکہ اس نے علی گڑھ میں سولہ برس گزارے تھے۔ قدیم کی شدید محبت جو اسے مولانا فاروق کے حلقہ تلمذ میں حاصل ہوئی تھی۔ تمام عمر اس کے ساتھ رہی۔ لیکن اب وہ جانتا تھا کہ قدیم کے استحکام اور بچاؤ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اصلاح اور ترمیم ہو اور جدید کی چند باتیں بھی اخذ کر لی جائیں۔ چنانچہ اس کے لئے شبلی نے قیام حیدر آباد کے دوران میں کوشش شروع کی۔ نواب حبیب الرحمن خاں شروانی کو جو ندوہ کی مجلس نصاب کے ناظم تھے۔ بڑے پر زور اور با اثر خط لکھے اور ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی۔

۱۹۰۳ء کے شروع میں مجلس انتظامیہ نے مولانا کو اتفاق رائے سے ندوہ کے دارالعلوم کا معتمد بنا کر قبول کر لیا تھا اور مولانا سے درخواست کی تھی کہ وہ لکھنؤ آکر قیام کریں۔ لیکن مولانا کوئی دو سال تک نہ آئے۔ مولانا کی ذہنی کشمکش اور طبعی تلون کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی تک اس امر کا بھی قطعی فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ وہ حیدر آباد چھوڑ کر

کہاں جائیں گے؛ ندوہ میں یا علی گڑھ میں؟ -
مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے کوئی تین مہینے بعد وہ حیدر آباد
سے مولوی حمید الدین کو لکھتے ہیں :-

میں یہاں سے چھوٹا تو اعظم گڑھ نہیں بلکہ ندوہ میں رہوں گا۔ یا
کالج میں۔

۱۹۰۴ء کے وسطِ اول میں علی گڑھ کی کشش زیادہ قوی معلوم
ہوتی ہے۔ مئی ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں :-
سامان ایسے نظر آتے ہیں کہ علی گڑھ کے دام میں دوبارہ گرفتار ہوں۔
اگرچہ یہ وہ دام ہے کہ

نالہ از بہرِ ربائی نہ کند مُرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

لیکن بالآخر قرعہٴ فال ندوہ کے نام پڑا اور وہ ۱۹۰۵ء کے شروع
میں باقاعدہ اس سے وابستہ ہو گئے۔

ندوہ کے نصاب کی اصلاح کے لئے امرتسر کے سالانہ اجلاس
میں بعض اصول مرتب ہوئے تھے۔ پھر مدراس کے اجلاس (منعقدہ
۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی نعمانی مولوی عبدالحی ناظم ندوہ اور ملا عبدالمجید
حیدر آبادی کی ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ جسے نصاب بنانے کا اختیار
دیا گیا۔ اس سب کمیٹی نے مولانا کی اکثر ترغیبات منظور کر لیں لیکن نئے
نصاب پر عمل درآمد شروع ہوتے دیر لگی اور جب تک مولانا نے
حیدرآد سے آکر ندوہ میں قیام نہ کیا اور نئے نصاب کو جبری طور پر
شروع نہ کیا۔ اکثر مدرسین خارج شدہ کتابیں ہی پڑھاتے رہے۔

اصلاحِ نصاب کا ایک بڑا جزو انگریزی کی تعلیم تھا۔ یہ ۱۹۰۱ء میں شروع ہوئی تھی۔ پھر ۱۹۰۵ء میں سب طلباء کے لئے لازمی کر دی گئی۔ ندوہ کی یہ خاص امتیازی شان سمجھی جاتی تھی لیکن اس کا جو حال رہا۔ وہ سید سلیمان کی زبان سے سنئے :-

۱۹۰۵ء میں دارالعلوم میں پندرہ روپے ماہوار پر ایک انگریزی کا ماسٹر مقرر ہو گیا اور کچھ طالب علموں نے ”اے بی سی ڈی“ پڑھنی شروع کی مگر یہ تعلیم دفع الوقتی سے زیادہ نہ تھی۔ ساہا سال کے بعد بھی کوئی پرائمر سے آگے نہیں بڑھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب مولانا مہتمم ہوئے تو ان کے اصرار سے صفر ۱۳۲۳ھ کے ایک جلسہ میں ہر ایک کے لئے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اور اس کی نگرانی کے لئے مولوی سید ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ مجلس دارالعلوم کے رکن منتخب ہوئے لیکن سرمایہ کی کمی کے سبب سے ماسٹروں کا بڑھانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے تعلیم کا نقص جاری رہا۔ ۱۹۰۵ء میں جب گورنمنٹ نے ۵۰۰ روپیہ ماہوار کی امداد مدرسہ کی دنیاوی تعلیم کے لئے منظور کی تو انگریزی اساتذہ ضرورت کے مطابق مقرر ہوا اور انگریزی تعلیم باقاعدہ جاری ہوئی۔“

انگریزی کی تعلیم شروع کرنے کے علاوہ قدیم علوم میں بھی تبدیلی کی گئی اور اس پر بھی ندوہ کو بڑا ناز تھا لیکن غور سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اصولی اصلاح نہیں ہوئی۔ درس نظامیہ میں فلسفہ منطق اور نحو کی بھرمار تھی مولانا نے یہ کیا کہ ان کی بعض کتابیں کم کر کے بعض نئے علوم داخل کر دیئے۔ فی نفسہ تو یہ ایک بڑی خدمت تھی لیکن نئے علوم داخل کرتے وقت نہ تو تفسیر و حدیث کو خاص

اہمیت دی گئی۔ جس سے ندوہ مذہبی حیثیت سے شاہ ولی اللہ کے طریقہ تعلیم کی (جو دیوبند میں جاری تھا) خصوصیات اخذ کر لیتا اور نہ ہی کوئی خاص طور پر مفید نئے علوم بڑھائے گئے۔ انگریزی کا جو حال تھا۔ وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ قدیم مدارس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں تاریخ و جغرافیہ جیسے ضروری علوم شامل نہیں۔ ندوہ میں بھی انھیں داخل کیا گیا۔ ان مدارس کی ایک اور کمی یہ ہے کہ فارسی، جس میں اسلامی ہندوستان کا بیشتر علمی اور مذہبی ذخیرہ جمع ہے۔ اسے ان مدرسوں میں باہر نہیں۔ ندوہ میں فارسی کے ساتھ بھی کوئی رعایت نہ برتی گئی۔ بلکہ جو نئے علوم یعنی علم الکلام اور عربی ادب درس میں داخل کئے گئے۔ وہ دینی اور دنیاوی فائدے کے لحاظ سے ان ہی علوم کے ہم پایہ تھے۔ جن کی انھوں نے جگہ لی تھی!!

ندوہ میں جو نصاب تعلیم میں تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ وہ ایک تعلیمی انقلاب کی حیثیت نہیں رکھتیں لیکن مولانا جیسے جلیل عالم اور انشا پر داز کا فیض دار العلوم کے لئے ایک بڑی نعمت تھا۔ مولانا جتنے بڑے مصنف تھے۔ اتنے بڑے معلم نہ تھے۔ علی گڑھ میں بطور ایک پروفیسر کے وہ خاص طور پر کامیاب نہ تھے لیکن ان میں ایک بڑی خوبی تھی۔ وہ عام طلباء پر ضرورت سے زیادہ توجہ صرف نہ کرتے۔ لیکن ہونہار اور منتخب طلباء پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ ندوہ کی مختصر دنیا میں اس وصف کی کارفرمائی کا خاص موقع تھا۔ چنانچہ شبلی چند ایسے برگزیدہ تلامذہ مثلاً سید سلیمان ندوی۔ مولوی عبدالسلام۔ مولوی مسعود علی ندوی کی ذہنی تربیت کر کے انھیں اپنے رنگ میں رنگ سکے۔ جن کے قوم پر بڑے

علمی احسانات ہیں اور جو شبلی کے کام کو جاری رکھ سکے۔

اس کے علاوہ درس میں بھی بعض امتیازی باتیں تھیں۔ قدیم عربی مدارس میں اُس قدیم عربی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس میں قدیم مصنفین اور ائمہ فن کی تصانیف ہیں۔ یہ زبان جدید عربی سے، جس میں شام اور مصر کے اخبار لکھے جاتے ہیں۔ بالکل مختلف ہے۔ ندوہ میں جدید عربی پر زیادہ توجہ دی گئی۔ فی نفسہ یہ بھی ایک اتنی بڑی خوبی نہیں۔ جتنا اسے ندوہ یا بعض انگریزی کالجوں میں خیال کیا جاتا ہے۔ انگلستان میں کوئی نہیں کہتا کہ انگریزی طریقہ تعلیم میں لاطینی کی جگہ جدید اطالین کوڑے دی جائے۔ اور فارسی کے جو اساتذہ سمجھتے ہیں کہ سعدی اور رومی کی غیر فانی تصنیفات سے واقف ہونے کے بجائے پورے داؤد اور جمال زادہ کے خیالات سے واقف ہونا زیادہ ضروری ہے۔ وہ شاید سعدی اور رومی سے انصاف نہیں کرتے۔ لیکن بہر کیف، روزمرہ کی بعض ضروریات، جدید اسلامی دنیا سے تعلقات قائم کرنے اور اسلامی ممالک کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جدید عربی مفید ہے اور ندوہ کا یہ ایک خوشگوار امتیاز ہے کہ وہ جدید عربی پر بھی توجہ ہوئی اور یہ کوشش کی گئی کہ طلباء جدید عربی سیکھ کر مصر و شام کے عربی رسائل پڑھ سکیں۔

مولانا شبلی کے تعلق کی وجہ سے ندوہ کے طریقہ تعلیم میں بعض خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں لیکن دارالعلوم پر ان کے جتنے احسانات بطور ایک مشہور اہل قلم کے تھے۔ بطور ایک معلم کے نہ تھے۔ ندوہ کیلئے ایک بڑا کام انھوں نے یہ کیا کہ یہاں ایک نہایت گراں قیمت کتب خانہ جمع کر دیا۔ وہ ایک مشہور مصنف تھے جانتے تھے کہ اچھی کتابیں کہاں کہاں جمع ہیں اپنا بیش قیمت ذخیرہ کتب ندوہ کو

بخش دیا اور اپنے اثر اور رسوخ سے کتب کے بعض بڑے قیمتی ذخیرے
ندوہ میں کھینچ لئے۔ جن میں بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں مرحوم
دہلی کے نواب ضیاء الدین احمد خاں دہلوی مرحوم اور حیدر آباد کے
نواب عماد الملک بلگرامی کے مجموعے حاصل ہیت رکھتے ہیں۔

لیکن شبلی نے ندوہ کی سب سے زیادہ خدمت اپنے قلم سے کی قومی
بہی خواہی کے تقاضے اور شبلی کی انانیت انھیں مختلف میدانوں میں
لے گئی۔ انھوں نے سیاسیات میں بھی ہاتھ مارا۔ ایک دارالعلوم
بھی چلانا چاہا۔ نصاب تعلیم میں بھی نئی راہیں نکالنے کی کوشش
کی لیکن وہ سب سے پہلے اور سب سے آخر ایک اہل قلم تھے اور
اپنے قلم سے ندوہ اور قوم کی خدمت کرنے کا انھیں موقع اندوہ
کے ذریعے ملا۔ جس کے وہ ۱۹۰۳ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک ایڈیٹر
رہے اور جس میں ان کے اور کئی دوسروں کے بیش قیمت علمی اور
ادبی مضمون شائع ہوئے۔ سید سلیمان ندوی اس رسالے کی
نسبت لکھتے ہیں :-

”اس رسالہ نے شاید سیکڑوں برس کے بعد علماء کی سطح جامد میں
حرکت پیدا کی تھی۔ اب تک علماء کے تحقیقاتی مسائل منطق عقائد
اور فقہ کے چند ایسے مسائل قرار پائے ہوئے تھے۔ جن پر گوہیت
کچھ لکھا جا چکا تھا۔ پھر بھی جو آتا تھا۔ وہ ان ہی کو ذرا دہرا کر
اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتا تھا۔ منطق اور فلسفہ کی بعض
درسی کتابوں کی شرحیں لکھنا۔ حاشیے لکھنا۔ غیر مفید مناظرانہ
رسائل تالیف کرنا۔ یہ علماء کے مشاغل تھے۔ حالانکہ زمانہ کا سطح

ادھر سے ادھر پھر چکا تھا اور حالات نے اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے کچھ اور ہی ضروریات پیدا کر دئے تھے۔ الندوہ کا بڑا فیض یہ ہے کہ اس نے علمائے کرام کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا.....

اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا۔ اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے نئے طریقے ان کو نظر آئے۔ زبان و بیان کے انداز اور پیرائے معلوم ہوئے اور جو اس کو پسند کرتے تھے وہ بھی اور جو نہیں پسند کرتے تھے وہ بھی اس کو پڑھ کر اس کے مطابق، لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔

الندوہ سے پہلے بھی ملک میں ایسے رسالے جاری ہو چکے تھے جن میں بلند پایہ علمی و ادبی مضامین چھپتے تھے۔ علی گڑھ کا مرحوم معارف ان میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ لاہور کا مخزن بھی الندوہ سے بہت پہلے شروع ہوا تھا۔ لیکن یہ رسالے نئے لوگوں کے تھے اور انھیں قدیم اسلامی مدارس اور علماء کے حلقوں میں بار نہ تھا۔ الندوہ ایک اسلامی مدرسے کا ترجمان تھا۔ طبقہ علماء پر اس کا زیادہ اثر ہونا ناگزیر تھا۔ اور اس کی توڑ پر جو رسالے نکلے (مثلاً دیوبند کا القاسم) ان سے بھی قدیم اسلامی مدارس کو فائدہ پہنچا۔

قوم کی عام علمی خدمت کے علاوہ الندوہ نے ندوہ کے موہنا طلباء کو موقع دیا کہ وہ تخریر و تصنیف کی ابتدائی منزلیں، ایک کہنہ مشق اور کامل الفن استاد کی نگرانی میں، دارالعلوم کے قیام میں ہی طے

کر لیں۔ سید سلیمان ندوی۔ مولوی عبدالسلام اور ندوہ کے کئی دوسرے مشہور اہل قلم حضرات کی بسم اللہ اسی دبستان میں ہوئی تھی۔ اور وہ مضامین، جنہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو ادبی حیثیت سے نہیں، بلکہ علمی اور مذہبی حیثیت سے پہلے پہل ملک کے سامنے پیش کیا۔ الندوہ میں ہی شائع ہوئے تھے۔ جس کے وہ ایک سال تک سب ایڈیٹر رہے۔

قوم کی علمی خدمت اور ہونہار طلباء کی تصنیفی تربیت کے علاوہ شبلی نے الندوہ کے ذریعے ندوہ کی آواز کو وہاں تک پہنچایا۔ جہاں اور کسی طرح اس کی رسائی نہ تھی۔ خالص تعلیمی حیثیت سے ندوہ ایک نہایت مختصر سا مدرسہ تھا۔ ۱۹۰۶ء تک اس کی مستقل آمدنی پونے دو سو روپے ماہوار سے زائد نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں کتنا بڑا ادارہ چل سکتا تھا۔ دیوبند اور دوسرے قدیم اسلامی مدارس کے سامنے اس کی کوئی ہستی نہ تھی۔ لیکن جس وقت ندوہ کی شہرت کا دھمکا ہر طرف بچ رہا تھا۔ قوم کے بااثر حلقوں میں ان دارالعلوموں سے، جن کے ایک درجے میں ندوۃ العلماء کے سارے مدرسے سے زیادہ طلباء زیر تعلیم تھے۔ ایک عام بے خبری تھی۔ اس کی ایک وجہ تو مولانا شبلی جیسی مشہور ہستی کا ندوہ سے انتساب تھا اور دوسرا سبب الندوہ تھا۔ جس کی وجہ سے قوم اربابِ ندوہ کے ارادوں، تجویزوں اور کارناموں سے پوری طرح باخبر تھی۔

مولانا کی توجہ اس وقت تمام تر ندوہ پر لگی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنی تصنیف و تابیع کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔

رکھوں کچھ اپنی بھی میں چشمِ خوش فشاں کیلئے

موازنہ انیس و دبیر ندوہ میں آکر ختم ہوا اور شعراِ عجم کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ سوخرا ذکر تالیف کے لئے مولانا نے ندوہ سے تین ماہ کی رخصتی اور بنارس میں جا کر قیام کیا۔ ۱۹۰۶ء میں وہ اپنے کالج کے شاگرد، مولانا محمد علی سے ملنے بڑودہ گئے اور یہ سفر اس لئے قابلِ یاد بن گیا کہ یہاں مولانا محمد علی کے ایما پر، انھیں مارگو لیٹھ کی کتاب کے جواب میں سیرۃ النبی اور عام اعتراضات کے جواب میں مضامین عالمگیر لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ وہ اعظم گڑھ اکثر آتے جاتے تھے اور ۱۹۰۷ء میں اعظم گڑھ میں وہ حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے انھیں ایک پاؤں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس کا تفصیلی بیان مولانا کی اپنی زبان سے سُنئے :-

ایک اتفاقی تقرب سے میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں آیا تھا اور ارادہ تھا کہ دو مہینے یہاں قیام کروں گا۔ شعراِ عجم کے اجزازہ زیرِ تحریر تھے۔ اور شاہنامہ پر ریویو کر رہا تھا۔ سترھویں مئی ۱۹۰۷ء قریباً دس بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اُٹھ کر زانہ کمرہ میں گیا۔ اندر تخت بچھے ہوئے تھے۔ میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ تخت پر کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی۔ میں نے ہاتھ میں اُٹھالی اور پھر ایک دوسرے شخص کے ہاتھ میں دے دی۔ اتفاق سے گھوڑا گر گیا۔ بندوق کی زد ٹھیک میرے پاؤں پر تھی۔ بندوق کی نال سے پاؤں تک صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا۔ کارتوس میں اگرچہ چھترے تھے لیکن چونکہ بڑے تھے اور فاصلہ بہت کم تھا۔ اس لئے ٹخنہ کی ہڈی چور ہو گئی اور پاؤں کٹ کر صرف

دو تسمے لگے رہ گئے۔

جس وقت ضرب لگی۔ مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ پاؤں کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی اور اس وقت میں نے گھبرا کر کہا کہ یہ کیا ہوا؟ آواز سن کر باہر سے بعض آدمی اندر آ گئے۔ اس وقت میں اسی طرح پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اور پاؤں جوتے میں تھے۔ ایک عزیز نے آ کر میرے پاؤں پر ہاتھ رکھا تو میں جوتے میں سے نکال لیا۔ اس وقت پاؤں کی اڑی جوتے میں پھنس کر رہ گئی۔ میں نے پاؤں اوپر اٹھا دیا اور نوکروں سے کہا کہ اس پر پانی ڈالو۔ پانی جب ڈالا جاتا تھا تو پاؤں میں بھک بھک دھواں نکلتا تھا۔ قریباً پاؤں گھنٹہ تک میں پاؤں اٹھائے بیٹھا رہا۔ جب پنڈلیاں دکھنے لگیں تو میں نے آدمی سے کہا کہ اب تکیہ لاکر میرا پاؤں اس پر رکھ دو۔ آدمی نے رو کر کہا۔ کیا چیز ہے۔ جو رکھی جائے مجھ کو اس وقت معلوم نہ تھا کہ میری اڑی جدا ہو کر جوتے میں رہ گئی ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ابتدا میں ایک فوری نظر کے سوا مطلق اپنے پاؤں پر نظر نہیں ڈالی اور جو کچھ میں نے پاؤں کے متعلق حالات بیان کئے ہیں۔ وہ ڈاکٹر اور دیگر حاضرین کی زبانی ہیں۔

اس وقت خاص عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا۔ نوکر اور ماؤ وغیرہ تھیں۔ یہ لوگ سخت زار و قطار روتے تھے اور میں ان کو منع کرتا تھا۔ قریباً ایک گھنٹہ کے بعد فرزند عزیز محمد حامد آیا اور زخم کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا اور بہت بے قراری کے ساتھ گریہ دزاری کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پر غشی سی طاری ہو گئی۔ میں نے نوکروں سے کہا کہ اس کے منہ پر پانی چھڑکو اور حلق میں پانی پٹکاؤ۔ اس سے اس کو

ہوش آگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے عزیز بھائی جنید۔ سول سرجن اور اسسٹنٹ سرجن کو ساتھ لے کر آئے۔ بڑی غلطی یہ ہوئی کہ جو رگیں کٹ گئی تھیں۔ ان سے شدت کے ساتھ خون جاری تھا اور خود مجھ کو اوپر نہ لو کروں چاکروں میں سے کسی کو خیال آیا کہ اس پر پٹی کس کر باندھ دیں۔ جس سے خون رُک جائے۔ بہر حال ڈاکٹر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ رگوں کے منہ باندھ دئے۔ جس سے خون رُک گیا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر یاؤں جو رُٹنے کے قابل ہو تو خیر ورنہ سرے سے نکال ڈالئے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ پاؤں کاٹنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ غرض بے ہوشی کی دوا پلائی گئی اور عمل جراحی شروع کیا گیا۔ چونکہ ہڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں۔ اس لئے نصف پینڈلی جدا کر دی گئی اور ہرزہ گردی کی سزا دی گئی۔ عمل جراحی کے پورے ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے ہوش آیا۔ اور زخموں کے ٹانکے اور رگوں کی کھچاؤ کی تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ آج نواں دن ہے۔ ڈاکٹر ایک دن بیچ میں دے کر زخم کھلتا ہے۔ دھو تا ہے اور پھر باندھ دیتا ہے۔ تکلیف میں ابھی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابتداء واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طہانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے۔ سوچتا ہوں تو لظرف آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟

ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی عمر پائی۔ بہت چلا پھرا۔ دوڑا۔ دھوپا۔ ملا۔ جلا۔ آخر

کہاں تک؟ خود پاؤں توڑ کر بیٹھنا چاہئے تھا۔ نہ بیٹھا تو قسمت نے
بٹھا دیا۔ ص

گرستانی بہ ستم می رسد

مولانا کی شدید قوتِ احساس اور کمزور طاقتِ برداشت کا سب سے
اعتراف کیا ہے۔ وہ ذرا سی باتِ خلافِ طبع ہونے پر تلملا اٹھتے تھے۔ اسی
خاصیت کا نتیجہ تھا کہ وہ علی گڑھ - حیدر آباد - ندوہ - جہاں بھی
رہے۔ بہت خوش نہیں رہے اور جم کر قیام نہ کر سکے۔ اس شاعرانہ
شدتِ احساس نے ان کے لئے زندگی دو بھر کر رکھی تھی اور ان کے
رفقا کو بھی سخت مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ یہ ایک قابلِ ذکر
بات ہے کہ دورِ حاضر کی کسی مشہور شخصیت کے طور پر نفوس سے اتنے
لوگ نالاں نہیں۔ جتنے قوم کے نہایت برگزیدہ اور مخلص انسان شبلی
تھے۔ شبلی کے شدتِ احساس کو ان کے معتقد بھی مانتے ہیں سید سلیمان
ان کے ”زود اشتغال جذبات“ کا ذکر کرتے ہیں اور مولانا جلیلی جہن
شروانی نے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جس میں ان کے روبرو ایک
نیم مردہ بھڑکے کاٹنے سے مولانا تلملا اٹھتے تھے اور آنکھوں میں
آنسو لے آتے تھے!

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولانا میں ایک خوبی تھی وہ اعصابی
کمزوری کی بنا پر ذرا سی بات پر تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ لیکن
جب ان کے سر پر آ رہے چلتے تو ان کے ماتھے پر شکن بھی نہ آتی۔ شبلی
مال کی آمد اور والد کی تقسیم جائیداد سے تو وہ اتنے جربز ہوئے کہ شریعت
کے احکام اور والدین کی اطاعت کے اُصولوں کو بھی بھول گئے لیکن

جب والد کی وفات ہوئی اور سوتیلی ماں سے اختلافات کا اصل زمانہ آیا تو انھوں نے وہ سعادت مندی اور برخورداری دکھائی کہ سوتیلی ماں بھی آفریں کہتی ہوگی۔ اسی طرح ایک نیم مردہ بھڑنے تو انھیں بے حال کر دیا۔ لیکن جب انھیں ایک حقیقی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ان کا پاؤں کٹا اور ان کے جسم کا ایک حصہ ان سے علیحدہ ہو گیا....

.... تو انھیں خیز تک نہ ہوئی!!

پاؤں کے حادثے نے مولانا کو سخت جسمانی اذیت میں مبتلا کیا۔ لیکن یہ ان کی ہمت اور استقلال کا امتحان تھا۔ وہ معمولی واقعات میں ضبط اور حوصلے کی ضرورت نہ سمجھیں لیکن کٹھن امتحانوں میں ناکام ہونا ان کی خودداری کو گوارا نہ تھا۔ وہ تین مہینے تک بسترِ علالت پر رہے۔ لیکن شکایت کا ایک حرف ان کی زبان سے نہیں نکلا۔ واقعہ کے کوئی تین ہفتے بعد مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:-

زخم کی حالت دس روز تک چھی تھی لیکن بعد کو ریم آنے لگی اور بات تک آتی ہے۔ اسسٹنٹ روزانہ آتا ہے اور دن میں دو بار زخم دیکھ جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک تکلیف میں کوئی کمی نہیں۔ تکلیف کو سخت ہے لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے۔ جنھوں نے سر کٹوائے تھے۔ پاؤں کٹنے پر کیا روؤں۔ فصیح و جملیل۔

مولانا کو پوری صحت ہوتے دیر لگی تو نواب محسن الملک نے علی گڑھ سے لکھا کہ آپ یہاں آجائیں۔ یہاں کے بہترین ڈاکٹر آپ کا علاج بلا معاوضہ کریں گے۔ لیکن مولانا علی گڑھ نہیں جاسکے۔ یہی گئے اور وہاں لکڑی کا ایک مسنوعی پاؤں بنوایا۔

پاؤں کٹ جانے سے مولانا کے قومی کاموں میں کوئی کمی نہ ہوئی۔
 بلکہ ایک مصنوعی پاؤں سے ان کی دشت پیمائی میں اور اضافہ ہو گیا۔
 اور مزاج میں ایک بالکل نئی وارستگی اور آزادی آگئی۔ وہ اب تک
 شدت جذبات کے باوجود سخت محتاط اور مصلحت شناس رہے تھے۔
 لیکن حادثہ 'یا کے بعد ان کے خیالات اور عمل میں ایک نئی بے باکی اور
 بے جگرگی سی نظر آتی ہے۔ جس کا اثر نہ صرف اسلامی ہندوستان کی ادبی
 تاریخ پر بلکہ قوم کی سیاسی رفتار پر بھی پڑا۔

ندوہ کے لئے بھی شبلی کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ اس
 سے پہلے انھوں نے ۱۹۰۵ء میں ندوہ کے لئے بھوپال سے پچاس روپے
 ماہوار کی امداد حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ ندوہ کے غریب طلباء کے
 لئے بھاوپور سے پچیس روپے اور حیدرآباد سے پچاس روپے ماہوار آتے
 تھے۔ ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد سے پچاس روپے ماہوار مولانا سید محمد علی
 صاحب ناظم ندوہ کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ لیکن انھوں نے بہ کمال
 اہتمام یہ رقم ندوہ کے نام منتقل کر دی۔ ندوہ ان ہی عطیوں کے ذریعے
 چلتا تھا۔ لیکن پونے دو سو روپے ماہوار سے ایک دارالعلوم نہیں چل
 سکتا۔ مولانا اور ان کے ساتھیوں کو جب سلامی ریاستوں اور سلطانوں
 سے کوئی خاص مدد نہ ملی تو انھوں نے انگریزی حکومت کا دروازہ
 کھٹکھٹایا۔

ندوہ ایک زمانے میں سیاسی حیثیت سے گورنمنٹ کی نظروں میں
 مشتبہ ہو گیا تھا۔ منشی محمد اطہر علی۔ نواب محسن الملک اور سٹیشن شرف الدین
 نے ان شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی اور جو شہبے باقی رہ گئے تھے

انھیں ۱۹۰۵ء میں پٹیا لہ کے فارن میسٹر کزنیل علیہ المجید خاں نے حکام سے مل کر دور کر دیا۔ اسی دوران میں مولانا نے الندوہ کی ایک شاعت میں ایک مضمون لکھا جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی وفاداری، سیاسی حیثیت سے ہی نہیں، بلکہ مذہبی احکام کی رو سے بھی فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریری مضمون کا بھی حکومت کو مطمئن کرنے میں بڑا دخل ہو گا۔

اسی اثناء میں ندوہ کے معاون اور شبلی کے دوست، منشی مشیر حسین قدوائی نے ایک انگریزی اخبار میں ایک مضمون لکھ کر حکمہ تعلیمات سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ندوہ کو امداد دے۔ اس مضمون کے جواب میں محکمہ تعلیمات کے افسر نے منشی صاحب کو لکھا۔ اگر ندوہ کو مدد کی ضرورت ہے تو وہ گورنمنٹ کے پاس درخواست بھیج سکتا ہے۔ چنانچہ ندوہ سے ”مالی اور اعزازی“ امداد کی درخواست بھیجی گئی اور طرفین کی خط و کتابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے ندوہ کو پانچ سو روپے ماہوار کی امداد اس شرط پر دینی قبول کی کہ یہ رقم مدرسہ کی غیر مذہبی تعلیم، یعنی انگریزی۔ ریاضی۔ عربی ادب وغیرہ پر

لے سید سلیمان ندوی حیات شبلی (ص ۶۳۱) میں لکھتے ہیں کہ ”یہ مضمون لکھ کر گویا مولانا نے گورنمنٹ کو اس کے اس پندرہ ہزار سالانہ امداد کی قیمت ادا کی جو اس نے دارالعلوم کو دینا منظور کی تھی۔“ لیکن یہ مضمون ستمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا اور گراؤٹ ۱۰ اربویر ۱۹۰۵ء کو جاری ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ مضمون ایک حسان کا معاوضہ نہ تھا بلکہ اگر مضمون اور سرکاری گراؤٹ میں کوئی تعلق ہے تو زرا امدادی کو اس قادرانہ قوی کا انعام سمجھنا چاہئے سید سلیمان یہ بھی لکھتے ہیں کہ مولانا نے رد مختار کے جس فقرے پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کا ترجمہ انھوں نے بالکل غلط کیا ہے۔

خروج ہو۔

ندوہ کا مدرسہ ابھی تک لکھنؤ کے اندر ایک پُرانی قسم کے مکان میں تھا۔ اور منظمین کا خیال تھا کہ ندوہ کے مکان کی بدحیثیتی اس کو ابھرنے نہیں دیتی۔ چنانچہ انھوں نے اس پر خاص توجہ شروع کی اور اپریل ۱۹۰۷ء میں کارکنان ندوہ کی طرف سے ایک پیل شائع ہوئی۔ جس میں مدرسہ کیلئے نئی عمارت کا تجزیہ پچاس ہزار روپیہ کیا گیا تھا اور یہ بھی کہا تھا تھا کہ اگر پچاس حضرات ایک ایک ہزار کے چندے دیں تو یہ نیک کام آسانی تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ اس کٹھن کام کو ندوہ کے باہمت سفیر مولوی غلام محمد شملوی نے بہت جلد پورا کر دیا۔ وہ ندوہ کی اپیل لیکر بہاول پور پہنچے جہاں بوب صاحب کی والدہ ماجدہ نے کہا کہ اس رقم کے لئے پچاس لی شخص کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ ساری رقم میرے بچے کے خزانے سے لے لی جائے!!

روپیے کا انتظام ہوا تو تعمیر عمارت کیلئے زمین کی فکر ہوئی۔ اس مشکل کو لکھنؤ کے حکام نے حل کر دیا۔ انھوں نے دریائے گومتی کے کنارے ایک وسیع اور خوش منظر قطعہ زمین جہاں ندوہ کی موجودہ عمارت ہے، بالکل برائے نام قیمت پر ندوہ کو دے دیا اور عمارت کیلئے جلسہ سنگ بنیادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ندوہ کو ان دونوں حکومت سے روابط بڑھانے کا خاص خیال تھا اور کچھ احسانات کا بوجھ ہلکا کرنے کا بھی احساس ہو گا۔ چنانچہ سنگ بنیاد رکھنے کے لئے صوبہ کے لٹنٹ گورنر صاحب کو دعوت دی گئی۔

کسی دوسرے مذہبی ادارے کا سنگ بنیاد کسی غیر مسلم یا سرکاری حاکم کے ہاتھوں رکھا جاتا تو پتہ نہیں مولانا شبلی کیسے کیسے فقرے کہتے لیکن اب اپنا معاملہ تھا جلسے کی روداد پڑھئے اور دیکھئے کہ شبلی خوشی سے کس طرح

انھد سے باہر ہو رہے تھے۔ فرماتے ہیں :-

یہ پہلا موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء یسائی فرمانروا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے، یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ سُنی ایک مذہبی درسگاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درسگاہ کا سنگ بنیاد ایک غیر مذہب کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا (مسجد نبوی کا منبر بھی ایک نصرانی نے بنایا تھا) غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مذہبی سقف کے نیچے نصرانی-مسلمان شیعہ-سُنی حنفی-دہابی-رند-زاہد-واعظ-خرقہ پوش اور کجکلاہ سب جمع تھے۔

آباد ایک گھر ہے جہاں خراب میں

جلسہ سنگ بنیاد کے بعد ندوہ کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں مولانا نے ایک فارسی ترکیب بند پڑھا۔ اگر اس نظم کا اس ترکیب بند سے موازنہ کریں جو اس سے چھ سال پہلے بشلی نے امرتسر کے اجلاس میں پڑھا تھا تو اس لطیف بلکہ عمیق فرق کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو شاعر کے نقطہ نظر میں اس دوران میں پیدا ہو گیا تھا۔

پہلے ترکیب بند میں، جسے ہم نے ندوہ کا مشورہ انتخابی کہا تھا، اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ ندوہ دیہی اور دنیا قدیم دور جدید کا سنگم ہوگا۔ لیکن اب ندوہ کو بالخصوص جدید کے مقابلے میں قدیم کا اور دنیا کے مقابلے میں دین کا ترجمان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جلسہ سنگ بنیاد نے اسے اجلاس کی کامیابی میں ایک باہمت، دنیا دار خالون کے عطیے کو بڑا دخل تھا لیکن اس اجلاس کے ترکیب بند میں دنیا داروں پر ایک لطیف مگر مسلسل طنز ہے۔ پہلے بند میں دنیا داروں کا بیان

اے کہ نیرنگ سرا پر دہ عالم دیدی جاہ کیخسرو و فرّ چشمِ حم دیدی
 ستائے جہانگیری خروخواندی زور بازوئے گند افکن رستم دیدی
 ابہا نگیری شمشیر و سناں شنیدی ہم طراز زندگی خامہ و خاتم دیدی
 الغرض ہرچہ جہاں را ہر سامان باشد ہمہ را دیدی و خود گیر کہ ہم دیدی
 ایک بالائے ترازیں جملہ جہانے دگر است
 کہ درو کا لدے دیگر جانے دگر است

پھر اُس دنیا کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس کی نمائندگی کا اَدعا ندوہ کو تھا۔
 سخن آنجا رود از منبر و محراب دعا گر حدیث ہما ز گنبد و ایوان باشد
 تو حدیث از ہم و کیخسرو و دارا گوئی سخن آنجا ز یحییٰ و نہ سلیمان باشد
 داستانہائے توافانہ شاہ است و وزیر حرف آں بزم ز پیغمبر و یزداں باشد
 تو بہ فرمودہ اسپیر و بیکن نازی سخن آنجا ہمہ انہ گفتہ یزداں باشد
 کم ز آئین جہان داری سوسن بود آں اساسے کہ بر آورده نغمال باشد
 اسی طرح جدید اور قدیم کا موازنہ ہے۔ امرتسر والے ترکیب بند میں
 شبلی نے جدید اور قدیم دونوں پر طعنہ زنی کی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے استاد
 مولانا محمد فاروق چریا کو ٹیٹے اس کے جواب میں اور قدیم کی حمایت
 میں بعض اشعار لکھے تھے لیکن اب ان کا نقطہ نظر وہی تھا جو اس سے
 چھ سال پہلے ان کے استاد کا تھا اور اب قدیم کے مقابلے میں جدید پر
 مسلسل طنز ہے۔

شرط اسلام نباشد کہ بڑیا طلبی التفات تو یہ دین نبوی کم باشد
 روز بازار بود فلسفہ و ہندسہ را نامہ شرح پر اگندہ و درہم باشد

رسم اسلام نباشد کہ بتحصیل علوم ہیئت و ہندسہ شرح مقدم باشد
 نکتہ و شرع بہ افسانہ برابر بنی یورپا کے ہندوؤں کے ہندو مسلم باشد
 حل ہر مسئلہ فقہ ز یورپ طلبی شرع پیش تو ز تقویم کہن کم باشد
 از ابو جبر و عمر هیچ بہ یاد نہاید گرمی بزم تو از سیزرا عظم باشد
 در سخن بگذر د از سیرت و شان نبوی ہر چہ گوئی ہمہ از گفتہ و لیم باشد
 شاید یہ اشعار پڑھ کر بعض لوگ پوچھیں کہ نئی نسل میں وہ کون سے لوگ
 ہیں۔ جو اسپنسر اور بیکن پرناز کرتے ہیں۔ یا آئین جہان داری سولن کو
 فقہ نعمانی پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ اس آئین سے صحیح طور پر آشنا بھی ہیں؟
 اسی طرح یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے مسلمان جو حضرت ابو بکر صدیق یا
 حضرت عمرؓ کو یاد نہیں کرتے اور جن کی سرگرمی محفل سیزرا عظم یا ”گفتہ و لیم“
 (۹) سے ہوتی ہے کہیں صفحہ ہستی پر موجود بھی ہیں۔ یا ان کا وجود فقط
 شاعر کے تخیل میں ہے؟ یہ سوالات بیجا نہیں اور شبلی نے جو کچھ بالصرحت
 بالا لیا کہا ہے اسے ہو بہو اور ہر حیثیت سے واقعات کے مطابق ثابت کرنا
 کسی قدر مشکل ہے لیکن شبلی ایک وکس اور مناظر پہلے تھے مصنف بعد میں ہوئے
 الفاظ ان کے لئے فقط اظہار حقیقت کا ذریعہ نہ تھے۔ بلکہ خیالات کو بدلنے
 اور ”آدمیوں کے دل پر حکومت“ کرنے کا آلہ کار۔ انھیں ندوہ کی
 کی ضرورت اور اہمیت واضح کرنی تھی اور اگر اس نیک مقصد کے لئے
 مستثنیات کو کلیات بنا کر پیش کر دیا جائے تو اس میں کون سی بڑی قیادت

جلسہ سنگ بنیاد بخیر و خوبی ختم ہوا لیکن افسوس کہ نئی عمارت مولانا کی اُمید و کامرانی نہیں بلکہ مرنے ثابت ہوئی۔ انھیں آئیں درس دینا نصیب نہ ہوا۔ بلکہ ان کی آنکھوں کے سامنے، ان کے حریف، ان کے ندوہ سے نکل جانے کے بعد پہلی مرتبہ یہاں آئے۔

اس کے علاوہ یہ عمارت بھی مکمل نہ ہو سکی۔ جب نواب صاحب پور کی والدہ ماجدہ نے پچاس ہزار روپے تھے تو اس وقت توقع تھی کہ اگر خرچہ تخمینے سے زیادہ ہوا تو مزید رقم بھی ملے گی لیکن اس اثنائیں (دوبند کے) علما بہاد پور جا پہنچے۔ انھوں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ ”مذوقہ العلماء کے دارالعلوم میں (نفوذ باللہ) الحاد ولا مذہبی کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس میں روپیہ دینا معصیت ہے۔“

اس خبر سے مضطرب ہو کر بیگم صاحبہ نے مولوی سر رحیم بخش مرحوم پریزیڈنٹ کونسل ریاست کو (جن کی تحریک سے رقم بالاطاعت تھی) بلا کر کہا ”سائیں جی روپیہ کس کو دلوادیا۔“ ایک مولوی صاحب نے رفع الزام کی کوشش کی تاہم شوقِ امداد سرد ہو گیا۔ مزید رقم نہ مل سکی اور عمارت آج تک ناتمام ہے۔

جس زمانے میں جلسہ سنگ بنیاد کے انتظامات کے لئے مولانا کو لکھنؤ آنا پڑا۔ وہ بمبئی کے چمن زار میں مصروفِ گل چینی تھے۔ اس حالت میں انھیں بمبئی چھوڑنا سخت ناگوار تھا۔ کئی خطوں میں اس کی شکایت کی ہے۔ ایک خط میں نواب حبیب الرحمن شردانی کو لکھتے ہیں:-

عین اس وقت کہ چن زارِ بمبئی کی گلگشت نے عالمِ طلسم میں پہنچا دیا تھا
 بہاولپور کے عہدہ داروں کا خط پہنچا کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے
 معائنہ کو آتے ہیں اور اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل اسی
 حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شہزاد نے بہشتِ عدن کو خیر یاد کہا تھا۔
 ایک اور خط میں ہے :-

اب کے بمبئی میں عجیبے تکین صحبتیں رہیں۔ لیکن عین عالمِ لطف میں ندوہ کی
 ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا۔ لیکن آنکھوں میں اب تک وہ
 تماشا پھر رہا ہے۔

مولانا دلی پر پتھر رکھ کے اور اپنی ذاتی دلچسپیوں پر قومی فرائض کو
 ترجیح دے کر بمبئی سے لکھنؤ آ گئے۔ لیکن یہ دلچسپیاں بھی ان کی زندگی
 کا ایک ضروری، بلکہ عزیز جزو تھیں۔ شبلی کے دوسرے سوانح نگاروں
 کی طرح ان سے جتنم پوشی کر کے صحیح شبلی کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے
 آئندہ باب میں ہم کسی قدر تفصیل سے ان کا ذکر کریں گے :

وادیِ گل

زُہدِ رامنِ آشنائی دادہ ام با عاشقی

ورنہ عمرے ہر دورا با ہم نفلق افتادہ بود (شبلی)
 شبلی کے مشاغلِ شباب کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے لکھا کہ وہ یہ یک وقت
 مذہبِ حنفیہ کے ایک قشدِ پرتار اور اعظم گڑھ کے رئیس المتغزلین تھے۔
 وہ اس زمانے میں تارکینِ صلوٰۃ کو ناز نہ پڑھنے پر دودھ کھنٹے تک
 پیٹا کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ شہر میں جو مشاعرے ہوتے تھے۔ ان
 کے میں مجلس بنتے اور گرم گرم عاشقانہ اشعار لکھتے۔ وہ علی گڑھ گئے تو
 ان کی فطرت کی یہ تشویش کسی قدر دب گئی لیکن ایک فطری شاعر کی طبیعت
 کو قومی مصلحت کی زنجیریں کب تک جکڑ سکتی ہیں۔ انھیں اس فضا
 سے ذرا بھی نکلنے کا موقع ملتا تو پُرانے مشاغل پھر تازہ ہو جاتے۔ انھوں
 نے روم و مصر و شام کے سفر پر جو نظم لکھی ہے۔ اس میں شبلی کی بوقلمونی
 طبیعت کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

گاہ در حلقہٴ زندانِ نظر باز آمد	گاہ در بزمِ فقیہانِ گراں مابر رسید
گاہ بادیہ و راں پردہ دراز آمد	گاہ با سادہ دلاں شیوہٴ تقلید گرفت
از رخ شاہدینِ پردہ بر انداز آمد	گاہ در بیتِ مقدسِ بزمِ ہفتی شہر
بہ تفسیرِ سند و در جلوہٴ گہ ناز آمد	گاہ در قافہٴ ہریانِ تقاضائے ہوس

وہ حیدر آباد گئے تو یہ زنجیریں اور ڈھیلی ہو گئیں اب وہ داغ و غیرہ کی صحبت میں غل سرائی کرتے۔ گاہے گاہے ممبئی بھی جاتے لیکن اس زمانے کے مشاغل نگیں کسی صراحت سے صفحہ قرطاس پر ثبت نہیں ہوئے۔ اس لئے ان کی نسبت جو کچھ لکھا جائے گا۔ وہ قیاس آرائی سے زیادہ نہیں۔ بعض خطوط میں مہم اشارات ہیں۔ جو خدا معلوم کس بات کی نسبت ہیں۔ ایک خط میں نواب حبیب الرحمن شروانی کو، جو ان کے محرم راز دوست تھے لکھتے ہیں :-

مدرسہ ضرور تشریف لائیے۔ مجاز قفۃ الحقیقت ہے۔

اس کے کوئی تین چار ہفتے بعد جب مولانا شروانی مدرسہ ہو کر واپس گئے۔ اور وہاں سے شاید ان مشاغل مدرسہ کی نسبت کچھ لکھا تو شبلی جواب میں کہتے ہیں :-

میں نے مدرسہ میں نئی دادی میں قدم نہیں رکھا بلکہ یہ پڑانا کوچہ تھا جس کی مدتوں خاک چھانی۔ صدر باہم از مستحقین اسے بودہ ایم۔ زمانہ کے ہاتھوں دوسروں کے لئے اپنی جگہ خالی کرنی پڑی تھی۔

ازہاں بزم کہ بزم من گریے راہ نہشت باید رفت کہ بہرِ گراں جا باشد
اس کے بعد مولانا ذوق العلوم لکھنؤ میں چلے گئے، اور ایک مذہبی درسگاہ کے صدر نشین ہوئے۔ بظاہر تو اس تعلق کو ان کی رومانی زندگی کا خاتمہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن انسانی فطرت ایک بڑی پیچیدہ اور جامد چیز ہے۔ شبلی نے اپنے آپ کو نندوہ سے بعض قومی اور ذاتی مصلحتوں کی بنا پر وابستہ کیا تھا۔ وہ وہاں سے کسی ایسے فوری، شدید اثر و جذبے کے تحت نہیں گئے تھے جو انسانی طبیعت میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ جو آگ ان کے دل کے اندر اعظم گڑھ اور حیدر آباد میں سلگ رہی تھی۔ وہ اب بھی

نہ بھی تھی۔ ان کی طبیعت کی تنوعیت برابر قائم تھی بلکہ جس افراط سے ان کی زندگی کا مذہبی پہلو زیادہ نمایاں ہوا۔ اسی شدت سے ان کی اندرونی آگ اور بھڑک اُٹھی۔ لیکن اس مردِ باندہیر نے جو بہ یک وقت مختلف معبودوں کی پرستش میں کامل دسترس رکھنا تھا۔ ان مخالف جذبات کی تسکین کا سامان کر لیا اور وہ بھی اس خوش اسلوبی سے کہ ان میں کوئی کشمکش پیدا نہ ہوئی انھوں نے لکھنؤ سے بہت دور ایک آستانہ ڈھونڈ لیا۔ جہاں ایک حسنِ بہت شاعر کے دل کی ساری حسرتیں پوری ہوتیں۔ لیکن جب وہ لکھنؤ پہنچے تو پھر جُتہ و عمامہ پہن کر مجلسِ علما میں صدر پر جا بیٹھے۔ اور زبانِ حال، بلکہ زبانِ قال سے کہہ اُٹھتے تھے۔

شاعری از من مجبور از سوادِ ممبئی
حالیا شبلی شدم، رندِ غزلِ خواںِ نسیم

اور یہ

زمبئی چوں بہ ہندوستان رسمِ شبلی زیادہ بگزم و باز پار ساگردم
شبلی کی رومانوی زندگی کا پہلا رنگیں مرقع دستہ گل ہے جس کی غزلیں
ستمبر ۱۹۰۶ء سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کے شانِ نزول کی نسبت ہمدی
کو ۱۱ ستمبر کے ایک خط میں ممبئی سے لکھتے ہیں :-

”۱۹ برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب
کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا۔ اپنا تو یہاں ایک عجیب سیرگاہ ہے۔
اور چوپاٹی اس کا جواب ہے۔ خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے۔

کنارِ آبِ چوپاٹی و گلگشتِ اپالورا

اس غزل کا ایک شعر یہ ہے۔

پہر سوا ز ہجوم دلبران شوخ بے پروا گذشتن از سرِ مشکِ لُقا دستِ ہرورا
تین چار غزلیں لکھیں جو کبھی آپ کی نظر سے گزریں گی؟

دستِ گلِ صبیح معنوں میں ایک پھولوں کا گلہ سستہ ہے اور پھول بھی ایسے،
جن کی شادابی اور خوبی رنگ و بو کا ہندوستان کی فارسی شاعری میں جواب
نہیں۔ یہ غزلیں، الفاظ کے انتخاب، خیالات کی تازگی اور طرزِ ادا کی
شستگی میں نرختے ہوئے ہیرے ہیں لیکن جذبات کی شدت دیکھیں تو
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زبردست طوفانی دریا، جو مدتوں اینٹ پتھر
کے ایک بندے کو تار رہا۔ اب بند توڑ چکا ہے اور پورے زور شور

سے بہہ رہا ہے۔ پہلی غزل ہے یہ

چند بیہودہ بہ بندِ غم دنیا با شتم
ز بس سپس با قبح و بادہ و مینا با شتم
جبہ سائے حرم کعبہ چو بودم یک چند
بر در بندکدہ ہم ناصبیہ فرسا با شتم
گرچہ زندی و ہوس شیوہ دانا بود
حاجتم نیست کہ فرزند و دانا با شتم
بادہ ہر چند تیرِ خرقہ تو اس نیز کشید
ز گس مست کیسے خواست کہ سوا با شتم!

ایک اور غزل میں اسی کیف و مسرتی کا اظہار ہے یہ

اندکے نیز بہ کام دل خود میں با شتم
روز گالے چو دم از دانش و عرفانِ دہ ام
چند در پردہ تو اس کرد سخن، فاش بگوئے
سنگ بر شیشہ تقویٰ ز دہ ام۔ ہاں دہ ام
داستانِ گردم از بس کہ باین ہر درع
باستان جامِ طرب بانی و دستانِ ز دہ ام
ساغرے چند بہ یادِ رخِ رنگیں خوردم
قدحے چند در آغوشِ گلستاں ز دہ ام
جامہ ز ہر چہ بر قامت من راست نبود
شیشہ تقویٰ سی سالہ بہ سداں ز دہ ام

اسی غزل میں آگے چل کر کہتے ہیں:-

آں شد لے دوست کہ آراستے پکیرن
نقشِ زیبا صنمے برودقِ جاں ز دہ ام

اُس شملے دوست کہ درندہ بینی بازم کہ دم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام
 ہاں دہاں دست بداریہ زن لے احباب کہ بہ زیبا صنئے دست بہ پیاں زدہ ام
 لطیفہ :- شبلی نے اپنا مفہوم واضح کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت
 نہیں کیا لیکن جس حسنِ ظن سے دیوان حافظ کی ترجیہ لکھی جاتی ہیں۔ بالکل
 اسی کو کام میں لاکر سید سلیمان، دوسرے شعر کے ”دشمنِ ایماں“ کی نسبت
 فرماتے ہیں :-

وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے۔ وہ غلطی سے اس دشمنِ ایماں کی تلاش
 بمبئی میں کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا یعنی کہ وہ علی گڑھ کی
 تحریک سے الگ ہو کر ندوہ میں شامل ہو گئے !

دوستہ کل زیادہ تر شاعر کے اپنے جذباتِ محبت کی رنگ و بو سے مہکتا
 ہے۔ لیکن ایک دو چیزیں اور بھی ہیں۔ جو ان اشعار میں بار بار آجاتی ہیں۔
 چمن زارِ بمبئی کی تعریف تو کثرت سے ہے۔ پہلی غزل کا مقطع ہے :-
 دامنِ عیش زدستم نہ رویتا شبلی
 دامنِ بمبئی از کفِ ندیم تا باشم
 دوسری غزل تمام بمبئی کی تعریف میں ہے۔ مطلع ہے :-

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را طرازِ مسندِ حبشید و زرتاجِ خسرو را
 ایک اور جگہ کہتے ہیں :-

ز ذوقِ طبعِ شبلی در اول روز دستم کہ در آشوبِ گاہِ بمبئی در باز دایاں را
 بیا ایچا کہ ہر سو کاواں کاواں بینی بُنانِ اذری را دلبرانِ تم و ایراں را

ایک اور مضمون جو کثرت سے دستہِ کل میں نظم ہوا ہے۔ ریاکاری کا ہے۔
 شبلی اپنے مشاغلِ بمبئی کا ندوۃ العلماء کے مقاصدِ متبرکہ سے موازنہ کرتے ہوں گے۔

بودل ہی دل میں ضرور ہنستے ہوں گے اور دل کا یہ چور کئی اشعار میں نظر آجاتا ہے۔ ”شیشہ تقوے“ کی شکست کے اشعار ہم درج کر چکے ہیں۔ الا باء کی ایک غزل میں یہی بیان ہوا ہے۔

من کہ در سینه دلم و شیدا پیغم
میل بالا را رخاں گز نہ کنم تاجہ کنم
ہست چل سال کہ یہودہ مکہ دشمنش
گز نہ بر سنگ نم شیشہ تقوے چہ کنم!
ان اشعار میں تو بے بس ہو کر راہ تقوے سے انحراف کا ذکر ہے۔ لیکن بعض شعروں میں شبلی اپنے اس ”تقوے اسی سالہ“ کی اصلیت سے بھی پردہ اٹھا دیتے ہیں۔

غیر ازین از رندی من تا بہ تقوے فرق نیست
بر ملا ہم کردم اکنوں، آنچہ پہاں کردہ ام!

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

از ہر دروغ خود بفریفتہ ام خلقے
اے دوست چہ ہے پرسی تا من چہ ہند ام!

ایک اور شعر میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

زما بگیر درس فنون ریا کہ ما

عمرے در از را ہر دستور بودہ ایم

دستہ گل کے اکثر اشعار خالص تغزل کے شاہکار ہیں۔ ششہ و پاکیزہ

ابو شبلی نے ایک صفحہ کاغذ پر یہ شعر اور اس غزل کے دو اور شعراپنے دست خاص سے لکھ کر عطیہ سلیم صاحبہ کو دئے تھے۔ جہاں اپنے دستخط کئے ہیں۔ وہاں یہ بھی لکھا ہے۔
”اگر در جائے کس است، یک حرف بس است۔“

لیکن کبھی کبھی غزل گوئی کے خارجی پہلو بھی بڑی طرح نمودار ہو گئے ہیں۔ اور شبلی کی بہترین غزلوں میں اس طرح کے شعر آ جاتے ہیں۔
 جائے آنست کہ گلشن دلداز کج بزم بوسہ ہا بسکہ بر آغ رض خنداں زدہ ام
 بوسہ ہا بر لپے شیں زدہ ام از بے ہم طوطی گرسنہ ام، بزم سکرستان زدہ ام
 اس قسم کے اشعار کو دیکھ کر مسٹر عبدالوجہ قریشی جنھوں نے شبلی کی حیات معاشقہ پر رسالہ کتاب بابت اپریل ۱۹۴۵ء میں ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے
 رقمطراز ہیں: ”اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا تو اس کا
 جنسی پہلو بھی ابتداء ہی سے نمایاں تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کے
 اشعار کو شبلی کے لکھنؤی مذاق شعر کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ انھوں نے کئی
 چشموں سے فیض حاصل کیا تھا اور آخر میں عام طور پر ان کا مذاق بچہ
 سلجھ گیا تھا۔ لیکن ان کی ابتدائی ادبی تربیت اودھ پنچ اور پیام بابر کے
 صفحات سے ہوئی تھی اور یہ اثر اخیر تک کچھ نہ کچھ قائم رہا۔ چنانچہ ذیل کے
 اشعار سے شبلی کی محبت کے جنسی یا غیر جنسی پہلوؤں پر اسے قائم کرنا صحیح
 نہیں۔ ان میں وہ فقط ہماری شاعری کی بعض سقیم اور مبتذل روایات
 کو نباہ رہے ہیں۔“

تو بدیں حسن تو نگہ چہ زیاں برداری
 ایں دو بوسہ تو اگر خود نہ تماری چہ شود
 مست دیر عریدہ تنگش بکشم در آغوش
 تشنہ و ضلم و تاکہ بہ محابا باشم

گو یاد دشمن ہم از دوش نصیب رہہ است بادہ و صلش چشیم از مذاق افتادہ بودا
 دستہ گل میں تین طرح کی غزلیں ہیں۔ پانچ ابتدائی غزلیں تو وہ ہیں۔

جوشلی نے ستمبر ۱۹۰۶ء میں بمبئی میں یا بمبئی سے واپس جاتے وقت لکھیں۔
 پھر کئی غزلیں ہیں۔ جو الہ آباد یا لکھنؤ میں لکھی گئیں اور جن میں یا تو بیتے
 ہوئے لمحوں کی یاد ہے۔ یا کسی مقامی فتنہ گر کی آرزو۔ غزلوں کا زیادہ حصہ
 وہ ہے۔ جو دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمبئی واپس جا کر لکھا گیا۔ پہلی دو تین غزلیں
 تو ایسی ہیں۔ جو آسمانِ بمبئی کے عام پر سواد منظر اور اختر و نجوم کی فراوانی
 کا بیان ہیں لیکن چوتھی غزل دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اب اس آسمان پر
 ایک ماہتاب نمودار ہو گیا ہے اور مولانا کے اشعار، عام شاعرانہ جذبات
 کا اظہار نہیں۔ بلکہ کسی ماہِ تمام کی پرستش کے گیت ہیں۔ اس غزل میں
 مولانا لکھتے ہیں ۵

ہاں وہاں ست بدایہ دزدمن لے اچاں کہ بہ زیبا صنمے دست بہ پمیاں زدہ ام
 کس چہ داند کہ بہ خلوت گر آں ماہِ تمام زدہ ام ساغر دبر یادِ حریفان زدہ ام
 مقطع میں تو صاف اظہار ہے ۵
 بے تو اں بُرد کہ این مزمزہ بے چہرے نیست شلی این تازہ نوا ہانہ چوں مستانِ دہ ام
 ستمبر ۱۹۰۶ء میں تو شلی تو ماہِ تمام کی فقط ایک آدھ جھلک نظر آتی تھی۔
 لیکن ۱۹۰۶ء کے آخر اور ۱۹۰۷ء کے شروع میں انھیں موقع ملا کہ وہ
 آرام و اطمینان سے اس کی ضیا بار یوں سے خطا اٹھائیں۔ مئی ۱۹۰۷ء

۵ یہ امر قابل ذکر ہے کہ معارفِ پریس میں جو دستہ رگل چھپی ہے۔ اس میں ماہِ تمام
 کو اسی طرح جلی قلم سے لکھا گیا ہے جس طرح دوسرے اسمائے معرفہ کو اور شلی نے
 مولانا ابو الکلام آزاد کے نام کی خطوں میں ماہِ کامل یا ماہِ تمام کا اس طرح ذکر
 کیا ہے۔ گویا اس سے کوئی خاص شخص مراد ہے۔

میں ان کے پاؤں کا واقعہ پیش آیا اور وہ پاؤں بنوانے کے لئے دسمبر ۱۹ء میں روانہ ہو گئے۔ اب جب تک پاؤں تیار نہ ہو جاتا۔ ان کا بمبئی رہنا ناگزیر تھا۔

اسی تقریب اُس گلی میں ہے۔ منتیں ہیں شکستہ پائی کی! چنانچہ وہ دسمبر۔ جنوری اور فروری کے کچھ دن بہارستان بمبئی میں ہے۔ جلوت اور خلوت کی صحبتوں میں شریک ہوئے اور وسط فروری میں ندوہ کے ضروری کاموں کے لئے بالکل مجبور ہو کر اور بڑی کراہت و تکلیف کے ساتھ لکھنؤ واپس گئے۔ اس دوران میں ”بڑی دلچسپیاں رہیں۔ جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں۔“ اور پچھلے سال کی بعض غزلوں کے ساتھ ایک گلہ استے میں بندھ کر دستہ گل کے نام سے شائع ہوئیں۔

بمبئی میں مولانا شبلی کو جس خاندان سے خاص دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس میں دو بہنیں تھیں عطیہ بیگم صاحبہ اور زہرا بیگم صاحبہ۔ مولانا ان کے والد سے قسطنطنیہ میں مل چکے تھے اور ان مہماں نوازی اور وطنی محبت کے بڑے معترف تھے۔ ان دونوں بہنوں نے، اس زمانے کی مسلمان خواتین کے مذاق کے خلاف اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ پردہ نہ کرتی تھیں اور قومی کاموں

۱۔ مثلاً شروع فروری میں ”بمبئی میں دو مسلم خواتین کا ایک لکچر“ تھا۔ ”مردوں میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی.....“ شریکِ جلسہ تھے۔ (ملاحظہ ہو بیسیہ اخبار، فروری ۱۹۰۷ء) اس کے بعد ان خواتین نے ایک تاریخی تماشہ (TABLEAU) کرنا چاہا تو تاریخی محلوں شبلی نے فراہم کیں۔ لیکن افسوس کہ تماشے کے انعقاد سے پہلے انھیں لکھنؤ جانا پڑا۔ (ملاحظہ ہو عطیہ بیگم صاحبہ کی (قلمی) خاندانی ڈائری)

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہتی تھیں۔ مولانا ان سے بڑے متاثر ہوئے اور ان دونوں کے نام ان کے جو مکتوبات خطوط شبلی کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ وہ مولانا کی زندگی کے ایک غیر معروف گوشے پر روشنی ڈالتے ہیں اور دستہ گل اور بوئے گل کی عقبی سرزمین کو نمایاں کرتے ہیں۔

خطوط شبلی میں عطیہ بیگم صاحبہ اور زہرا بیگم صاحبہ دونوں کے نام خطوط ہیں لیکن زیادہ تر عطیہ صاحبہ سے خطاب ہے۔ اور مولانا کو اس قابل اور باکمال بہت سہلہ لڑکی نے جس طرح مسحور و بخود بنا دیا تھا۔ اس کا اندازہ خطوط شبلی کے صفحے صفحے سے ہوتا ہے۔ وہ عطیہ بیگم کی بعض خوبیوں کا ذکر کر کے انھیں لکھتے ہیں۔

لے منتشر خطوط اور ہم اشعار کی بنا پر کسی کی داستانِ دل مرتب کرنا آسان نہیں لیکن جب فقیر میں سے ایک شبلی کی سی قومی اہمیت رکھتا ہو اور دوسرا پرائیویٹ خطوط کو اشاعت کے لئے حوالے کر دے تو پھر اس داستان کی ترتیب ناگزیر سی ہو جاتی ہے چنانچہ خطوط شبلی کی اشاعت کے بعد ”شبلی کی حیاتِ عاشقہ“ اور اس قسم کے عنوانوں سے رسائل میں مضامین چھپے ہیں۔ حال میں مولوی محمد امین زبیری نے شبلی کی زندگی کے رنگین پہلو پر ایک مختصر سا کتابچہ لکھا ہے۔ اور ہم نے بھی سطور آئندہ میں خطوط شبلی اور غزلیاتِ ممبئی کو ایک لڑی میں پرونا چاہا ہے۔

ان تحریروں میں غلطی اور غلط فہمی کی گنجائش ہے لیکن خوش قسمتی سے پچھلے دنوں خود عطیہ بیگم صاحبہ کے قلم سے مولانا شبلی اور خاندانِ فیضی کے تعلقات پر ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے جسے ہم اس کی اہمیت کے لحاظ سے ضمیمہ کے طور پر تمام کا تمام نقل کرتے ہیں۔ تاکہ غلط فہمیوں کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ (باقی آگے)

ان باتوں کے ساتھ اگر موسیقی سے بھی واقف ہو تو اجازت دو کہ لوگ تم کو
پوچھیں۔ وانا اقل العابدین (اور میں سب سے پہلا پجاری ہوں گا!)
ایک خط کا آغاز ہے:-

لنگِ شکم، شرارے مے نویسم
کفنِ خاکم، غبارے مے نویسم
قرۃ عینی! تہارا حظ جو مدت کے بعد ملا تو نے ساختہ میں نے آنکھوں سے
لگایا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا۔

ایک اور جگہ، اپنے ایک شعر کا، جس میں کنایتہ عطیہ صاحبہ کا نام آتا
تھا۔ لکھتے تھے:-

اسی اصول پر میرا یہ شعر بھی ہے اور یوں صراحتاً تمہارے لئے خیر قدم
وغیرہ سب لکھ چکا ہوں اور عطیہ! لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ)

عطیہ بیگم صاحبہ کے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ ان کے گھر میں مولانا کا استقبال بطور ایک
عالم، ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی شخص کے مبلغ کی طرح ہوا۔ لیکن ان کے دل میں
اور ہی جذبات بھڑک اٹھے۔ جن کی تندہی و تیزی سے وہ بے خبر تھیں۔

ہمارے خیال میں عطیہ بیگم صاحبہ کے اس اظہار کو بغیر کسی تامل و تردد کے دست مان لینا
چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ خطوطِ شبلی اور غزلیاتِ شبلی میں ایک آگ بھڑکتی ہے۔ لیکن اس امر کا
کوئی ثبوت نہیں کہ اس آگ کو شعلہ زن رکھنے کی عطیہ بیگم صاحبہ نے کوئی بھی کوشش کی
تھی انھوں نے شبلی کو ”بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح ان کا
استقبال کیا۔“ لیکن ”دیوانہ را ہوئے بس است“ شبلی کے ”زود اشتعال“ جذبات بھڑک
اٹے جن کا اظہار فارسی غزلیات اور اردو خطوط میں ہوا۔

ہر رنگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر

ہے! خطوطِ شبلی مشرقی ادب میں ایک بالکل انوکھی چیز ہے۔ بظاہر تو یہ چند صفحات کا ایک مختصر رسالہ ہے لیکن ان چند صفحات میں ہی محبت کا ایک مکمل ڈرامہ آگیا ہے۔ (اور اس انداز سے کہ اس میں آورد اور نقش کا شائبہ تک نہیں) ان خطوط میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک نندی ہے جو پہاڑی چشموں سے بھوٹی ہے۔ پہلے گلزاروں اور مرغزاروں کی سیر کرتی ہے۔ پھیلتی ہے اور تیز تر اور تند تر ہوتی جاتی ہے۔ پھر یک لخت تغافل اور عتاب کے صحرا میں جا کر آنکھ سے نہاں ہو جاتی ہے۔ خطوطِ شبلی میں محبت کی پہلیں ہیں۔ حسن و عشق کے راز و نیاز ہیں اور اخیر اخیر میں حسن کا جلالی رنگ جھلکتا ہے۔

علامہ شبلی اردو زبان کے بہترین مکتوب نگاروں میں سے ہیں۔ ان کے کتابت کے جو دو مجموعے دارالمصنفین نے شائع کئے ہیں ان میں ایک خاص شان ہے اور وہ شبلی کے رنگ انشا پر داری اور ایجاز کے نہایت خوشگوار نمونے ہیں لیکن ان میں ایک طرح کا نقشہ اور آورد ہے۔ یوں تو بلا دپورب کی وضعدار اور باتکلف سرزمین سے دیرِ حاضریں جتنے خطوط لکھنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ (مثلاً ہمدی حسن۔ نیاز فتحپوری) ان میں سے کسی کے خطوط بھی نے تکلف اور تخیل نہیں لیکن شبلی کی احتیاطِ قلم کی ایک خاص وجہ تھی۔ انھیں شروع سے ہی اپنی قابلیت اور صلاحیتوں پر اس طرح کا اعتماد تھا کہ وہ اپنے خطوط قلمِ سبھاں کر اور دل لگا کر لکھتے تھے۔ وہ ابھی بیس برس کے ہیں اور دس روپے کی محافظی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن خط

لکھیں گے تو فارسی میں اور اخیر میں کہیں گے ”نامہ را نگاہ دارید“ چنانچہ ان کے اس زمانے کے بعض خط محفوظ ہیں (مولانا کی اس خصوصیت نے ان کے مکاتیب میں ایک ادبی شان پیدا کر دی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں وہ بے تکلفی اور انتہائی خلوص نہیں جو خطوط شبلی کا زور ہے جن کی نسبت مولانا کو کبھی اس بات کا وہم بھی نہ ہوگا کہ ان کی اشاعت کی نوبت آجائے گی!

ہم خطوط شبلی سے طویل اقتضات نہیں دینا چاہتے (جس کسی کو انسانی نفسیات، ادب، یا شبلی کی ذات سے کوئی دلچسپی ہے۔ وہ اس گلستان کی خود سیر کرے گا اور ایک ایک پھول، ایک ایک پتی کا بغور معائنہ کرے گا۔ لیکن ان خطوط سے بعض مسائل کی نسبت شبلی کا بالکل نیا زاویہ نگاہ نظر آتا ہے اور ان میں سے ایک آدھ کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔

سید سلیمان لکھتے ہیں ”مولانا (شبلی) پردہ کے سخت مؤید تھے۔ اسی سٹر امیر علی کا جواب لکھا۔ بعنوان پردہ اور اسلام“ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۹۹ء میں رائٹ آرمیل سید امیر علی نے ایک انگریزی رسالہ میں مسلمان عورتوں کے متعلق ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان میں آج کل جو پردہ رائج ہے۔ وہ قرآنی نہیں اور ظہور اسلام کے بہت بعد مسلمانوں میں رائج ہوا۔ شبلی نے چند برس بعد الذودہ میں اس کا جواب لکھا اور کہا کہ عرب میں پردہ کا رواج اسلام سے بعد کا نہیں بلکہ پہلے کا ہے اور شعرائے جاہلیت کے کلام سے طویل حوالے دے کر ثابت کیا کہ ظہور اسلام سے پہلے تو عرب کے بعض قبیلوں میں مرد بھی ”برقع پہن کر“ اور ”چہروں پر نقاب“ ڈال کر گھر سے باہر نکلتے تھے!!

اپنے مضمون میں علامہ شبلی نے نہ صرف ”نئے تعلیم یافتہ گروہ کے سب سے مشہور اور مستند مصنف“ کے ”بلغ علم“ کا مذاق اڑایا بلکہ لگے ہاتھوں امام اللہ شاہ ولی اللہ کے ”مہم“ ترجمہ قرآن پر بھی ہاتھ صاف کر گئے۔ جس پر سید امیر علی نے اپنے دعوے کی بنیاد رکھی تھی۔

جب علامہ شبلی نے اپنا مضمون لکھا تو اس وقت ان کی پہلی بیوی کی وفات ہو چکی تھی اور وہ نسوانی اثرات سے بالکل آزاد تھے۔ شبلی کے دوست مہدی حسن صاحب نے اس مضمون پر چند سال بعد تبصرہ کیا اور نہایت لطیف اور مودبانہ طریقے سے عورتوں اور پردہ کے متعلق شبلی کے خیالات کی شکایت کی اور انھیں مخاطب کر کے یہ شعر نقل کیا۔

تراگا ہے گریبانے نہ شد چاک

چردانی لذت دیوانگی را!

مہدی صاحب کو کیا معلوم تھا کہ ایک دو سال کے اندر شبلی کا گریبان کس طرح چاک ہو گا اور وہ نئے میدان میں بھی حقوق نسواں کے حامیوں سے کس طرح باز ی لے جائیں گے۔ ان کے مضمون کو کوئی سال دو سال نہ گزرے ہوں گے کہ شبلی کے آسمان محبت پر ایک ماہتاب طلوع ہوا جس نے ان کے خیالات میں عجیب طرح کا موج پیدا کر دیا۔ یون تو عطیہ بیگم کے

لے انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ امر ظاہر کر دیا جائے کہ جب اخیر عمر میں شبلی نے عیسائی مسنف اور معترفوں کے جواب میں سیرت النبی کھنٹی شروع کی اور دیکھا کہ اس میدان میں ان سے پہلے سرسید اور سید امیر علی کتنا کام کر چکے ہیں تو ان کے دل میں ان دونوں کے علمی کا ناموں کی قدر بڑھ گئی۔ سرسید کے خطبات کا ذکر انھوں نے تعریف کے پیرائے میں کیا ہے اور مولانا امیر علی کی علمی شخصیت کی تو کئی جگہ بالصلاحیت تعریف ہے۔

نام شبلی کے تمام خطوط ان کی طبیعت کے انقلاب کا پتہ دیتے ہیں۔ لیکن عورتوں کی تعلیم کے متعلق دونوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی۔ اس سے تو خاص طور پر شبلی کی شخصیت کے بعض غیر معروف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

عورتوں کی تعلیم کے متعلق عطیہ بیگم صاحبہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ انہیں عام دنیوی اور معاشی علوم کی تعلیم سے مردوں سے آزاد اور بے پروا کرنے کی ضرورت نہیں اور ان کی تعلیم مردوں سے مختلف ہونی چاہئے۔ اس پر مولانا انہیں لکھتے ہیں :-

عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل کئے کہ عورتیں ان کی دستگیر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو لیکن یہ تو پُرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان۔ پان۔ چھوٹی موٹی اور روٹی کا کالا ہونا چاہئے۔ جمال اور حسن۔ نزاکت پر موقوف نہیں۔ توندی۔ دلیری۔ دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مرد و عورت دونوں نذات سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔

جواب میں عطیہ صاحبہ نے اپنی رائے پر اصرار کیا اور غالباً دیو پیکر عورتوں کے خلاف کچھ لکھا۔ لیکن مولانا کی دماغی گہرائیوں میں جو سوانیت پنہاں تھی۔ اس کا تقاضا کہ وہ محبوب کو بھی مردانہ رنگ میں زیادہ پسند کریں۔ وہ جواب میں لکھتے ہیں :-

عورتوں کی دیو پیکری پر تم نے اس قدر طولانی تحریر لکھی لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو مسلم ہے کہ صحت کے لئے تندرستی کے لئے جسم

کی موزونی کے لئے، جامہ زیبی کے لئے مردانہ ورزخیں مفید ہیں جو کچھ بحث ہے یہ ہے کہ عورتوں کے زمانہ حسن میں فرق آتا ہے۔ یہ کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ صون میری رائے نہیں۔ بڑے بڑے اہل نظر کا یہی فیصلہ ہے۔ کافی ہمدانی کے قصیدے کے چند شعر لکھتا ہوں۔

میران سپاہ اند و عروسان ذائق اند گدوان جہاں اند ہر بران زمان اند
چون سیم ہمہ پاک تن و پاک جبیں اند چون سنگ ہمہ سخت دل و سخت کماں اند
باقرہ ردی ہمہ چوں بدر شیر اند بزمکب تازی ہمہ چوں باد فراں اند
مانند تدروند چو با جام شراب اند مانند ہر بر اند چو با شیخ و ستار اند
جمالیاتی نقطہ نظر کے علاوہ حقوق نسواں کا یہ نیا ترجمہ ان عورتوں کو مرد بننے کی اس لئے بھی تلقین کر رہا تھا کہ وہ مردوں سے اپنے حقوق واپس لے سکیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:-

سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک عورتیں نازک بن رہیں گی مردان کو پرے حقوق نہ دیں گے۔

شبلی نے اپنی رائے کی تائید میں بڑی محکم دلیلیں دیں لیکن ان کا مقابلہ مردانہ رنگ کی ایک مستقل مزاج عورت سے تھا۔ بالآخر انھیں متقیان ڈالنے پڑے اور اس میں بھی انھوں نے ایک جذباتی لذت محسوس کی عطیہ کو لکھتے ہیں:-

مردانہ تعلیم میں میں ہارا اور تم جیتیں لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے اور عطیہ! میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ ہی پاتا ہوں۔

خطوط شبلی میں تو ان راز و نیاز باتوں اور دلی خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ لیکن شبلی کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی تھا جس کا ترجمان اندر وہ تھا۔

اور جس کا اظہار اس مضمون میں کیا گیا تھا۔ جو سید امیر علی کے خیالات کی تردید میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بھی اس رسالے میں عورتوں اور وطن کی تعلیم کے متعلق اس طرح کے خیالات ظاہر ہوتے رہے۔ جو شبلی چند سال پہلے خود ظاہر کر چکے تھے۔ لیکن اب ان سے باز پرس کرنے والی ہستیاں نمودار ہو چکی تھیں۔ چنانچہ جب مسٹر مشیر حسین قدوائی نے اسی رنگ کا ایک مضمون النذوہ میں چھپوایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ عورتوں کی تعلیم محدود ہونی چاہئے۔ تو عطیہ یکم صاحبہ نے فوراً مولانا شبلی کو ڈانٹ کر لکھا:۔

ایسے مضامین آپ کو شائع نہیں کرنے چاہئیں۔

مولانا نے پھر ہتھیار ڈال دئے اور نہایت معذرت آموز پیرائے میں جواب دیا:۔

مشیر حسین صاحب کا مضمون میں نے چھپنے سے پہلے ہرگز نہیں دیکھا کسی غلط تم کو لکھ دیا۔ ہاں میں نے کسی قدر اس کو پسند کیا تھا۔ یعنی طرزِ عبارت کے لحاظ سے۔ ورنہ مجھ کو خود اس مضمون پر اعتراض ہے اور اس کو ناقابلِ عمل قرار کرتا ہوں۔

افسوس، مشیر حسین صاحب نے شبلی کا اپنا النذوہ والا مضمون، عطیہ صاحبہ کی خدمت میں پیش نہیں کیا۔ ورنہ وہاں سے جو ڈانٹ ملتی اندہ شبلی جس طرح معذرت خواہی میں سر نہیا زجھکا دیتے۔ یا اپنے مضمون کی تاویلیں کرتے۔ اس کا قصور ہی لطف الکلیر ہے۔

بڑا مزہ ہو کہ محشر میں ہم کریں شکوے

وہ سنتوں سے کہیں، چپے ہو خدا کے لئے!

بس
خطوطِ شبلی کے ایک انداز سے خیال ہوتا ہے کہ دستہِ مگل کی بعض غزلیں

اسی نئے کا اثر تھیں جس نے خطوطِ شبلی کو ایک خمکۂ محبت بنا دیا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی غزل کس لمحے کی یادگار ہے اور اس میں کس واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ آسان نہیں۔ یہ تو ایسا کام ہے۔ جسے اگر ”عالم السرائر“ مولانا ابوالکلام آزاد (جو بیبی کی بعض رنگین صحبتوں میں شبلی کے شریک تھے) چاہیں۔ تو بخوبی سراجام دے سکتے ہیں اور دلداد کا شبلی کو ممنون کر سکتے ہیں لیکن اس زمانے میں شبلی پر جو عام کیف و مستی چھائی تھی۔ اس کا اندازہ دستہٴ گل کے اشارے سے بھی ہو سکتا ہے۔
فرماتے ہیں ۷

امنے نہ اند خلوتیان حجاز را	دیدنی تپاولِ خم زلفِ دراز را
ہرگز یکے بہ خوبی و رعنائی تو نیست	مادیدہ ایم کج کلہاں طراز را
بیچارہ نکتہ دانِ ادباے عشق نیست	ضائع کن یہ غیر نگہ ہائے راز را
ہر چند جو زبیر ز معشوق خوش بود	مابندہ ایم دلبر عاشقِ نواز را
آدر برم کہ کار ز اندازہ درگذشت	دستِ دراز گشتہ و آغوشِ باز را

شبلی اس عالمِ سرخوشی میں مستغرق تھے کہ انھیں مجبوراً ندوہ کے ضروری

۷ مولانا ابوالکلام آزاد کا شاید عطیہٴ سلیم صاحبہ سے اسی زمانے میں تعارف ہوا تھا۔ سلیم صاحبہ نے جس شبلی کے کاغذات کا جو پلندہ احوالے کیا۔ اس میں مولانا کے بھی دو خطوط تھے۔ ایک ۱۹۲۳ء کا ہے۔ اس کا آغاز تھا: ”یاد فرمائی گا شکریہ۔ بلاشبہ ایک گرفتاری سے تو رہائی مل چکی ہے لیکن اور کتنی ہی گرفتاریاں باقی ہیں۔ اس گرفتاری کی مذلت بھی انکار لیکن بعض گرفتاریاں ایسی بھی ہیں کہ چھوٹا سا چاہیں بھی نہیں چھوٹ سکتیں مثلاً آپ کے لطف و عنایت کی سیری صغ
خلاص حافظ ازاں زلفِ مابدار باد“

کاموں کے لئے بمبئی کو الوداع کہنا پڑا لیکن اب انھوں نے وہ روابط جو
بمبئی میں قائم ہو گئے تھے۔ برقرار رکھے اور گھنٹہ پہنچتے ہی عطیہ اور زہرا کو خطوط لکھے
..... ان خطوط کا سلسلہ ۱۷ فروری ۱۹۰۷ء سے شروع ہوا

اور ایک طرف سے محبت اور عقیدت اور دوسری طرف سے ادب و احترام
کے جو بیج بوئے گئے تھے۔ وہ جڑ پکڑنے لگے لیکن ابھی چار پانچ خطوں ہی کی
نوبت آئی تھی کہ عطیہ بیگم کو یورپ کا سفر پیش آیا۔ پہلے مولانا کا ارادہ اور
قطعی ارادہ تھا کہ وہ الوداع کہنے کے لئے خود بمبئی آئیں لیکن پھر اس
خیال سے رُک گئے کہ ان کے لئے کسی عزیز دوست کی رخصت کے وقت تھل
کرنا بڑا دشوار تھا۔ چنانچہ انھوں نے دور سے خدا حافظ کہا اور ڈاک سے
وداعیہ نظم بھیج دی۔ ساتھ ہی ایک خط لکھا جس میں کے آخر میں ایک
فارسی شعر تھا۔

مے روی و گریہ مے آید مرا

ساعتے بنشیں کہ باراں بگدودا

شبلی نے عطیہ سے سفر یورپ کے دوران میں خط و کتابت جاری رکھی۔
لیکن وہ خطوط محفوظ نہیں رہے۔ جب وہ اکتوبر میں اس سفر سے واپس آئیں
تو شبلی نے ایک ایسا خیر مقدم لکھا جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوا ہو گا۔
بوئے گل کی پہلی غزل ہے۔

پیک فرخندہ قدم خروہ برآمد	کز سفر یار سفر کردہ مامے آید
رفت از شہر دایاں کہ بہاراں چمن	آمد آں گو نہ کہ در باغ صبا مے آید
گوشتا یوسف گم گشتہ بہ کنعاں آمد	یا نگار مینی سوئے صبا مے آید
رفتش گرچہ بکام دلِ حباب نہ بود	چوں بیامد بہ مراد دلِ مامے آید

خوئے خوش بہاں لطفِ محفّا ہست کہ بود
ہم بدایں قاعدہ مہر و وفا مے آید
بوجہ آنکہ مشامِ دل و مجاہد تازہ کند
جے تو اس یافت کز ان بندِ قبلے آید
ہر کجائے گذر و عطرِ فشاں مے گذرد
ہر نیسے کہ از ان زلفِ دوتا مے آید
لے دے سحر از چرخِ فردا آنکسوں
ہاں کہے خواستی اور ابدِ عالمے آید

شبلی غمزدہ آور ددل و دیں بہ نثار
غیر از بنِ چسیت کہ از دست گدائے آید
لیکن شاید خیرِ مقدم نہ دوت سے زیادہ شورخ سمجھا گیا اور مولانا کی مصلحت
طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ اسے عطیہ تک پہنچائیں۔ اس کے لئے خیرِ مقدم کا ایک
ایک اور قطعہ لکھا گیا۔

نسیم صبح بیا د بہ مرد می پیش آ
پیام بندہ بہ آں خاکِ ستاں برساں

اس کے بعد خطوط کا سلسلہ پھرتے جاری ہوا اور شناسائی دوستی اور
دوستی بے تکلفی میں تبدیل ہو گئی۔ مولانا شبلی کے سب سے محبت بھرے خطوط
عطیہ بیگم کی ولایت سے واپسی کے بعد لکھے گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس
زمانے میں مایوسی و کشمکش کے بھی کئی دور آئے اور جو رنگین خواب کی نگہ
تصویر نے دیکھے تھے۔ ان کا پورا ہونا محال ہو گیا۔ واپس آکر عطیہ صاحبہ
نے جو پہلا خط لکھا۔ اس کے لب و لہجہ کی شبلی شکایت کرتے ہیں :-

میں خیال کرتا ہوں کہ یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بہت بالا کر دیا
ہے اس لئے یہ توقع کہ آپ اسی طرح ہم سے ملیں۔ یا ان اطراف کا قصد کر لیا۔
جیسا کہ وعدہ کیا تھا۔ اب صبح نہیں خط کی تحریر بھی بہت روکھی اور خود امانہ ہے۔

جس روز شبلی نے یہ شکایت لکھی۔ اس سے اگلے روز یعنی ۱ اکتوبر ۱۹۰۶ء

کی ایک غزل میں بھی اسی مایوسی و نا کامی کا اظہار ہے ۔
 زجاں گزشتہ و باز ہم بہ برنخے آید کہ نیست زوریم و آں بُت بہ زرنخے آید
 فراق و ہجر دیارِ خوشے بود کہ درو پس از گذشتن سب ہم سحر خے آید
 جُدا ز دوست ، شب ماہتاب را حکیم کہ کارِ عارض اوازِ قمر خے آید
 بہ خوارے کہ ز کوئے تو رفت نعمانی
 گماں برم کہ از یں پس دگر خے آید

اس کے سات روز بعد کی ایک غزل میں یہ اظہار اور بھی صاف ہے ۔
 آں شوخ را بہن سراں پُرس و جو نہاند یعنی گل مراد مر ازنگ و بونہاند
 بہر حیاں نوازش ظاہر ہاں بجا است پیدا است ایں کہ آں دُش پُرس و جو نہاند
 شبلی ہر آنچہ داشت بدلِ رزباں فکند گویا کہ کارِ باصنم تہ نہ خو نہاند
 اب حشرِ میڈوں پر غالب آگئیں اور کیف آور آرزوں کی جگہ سوہان روح یاد نے
 لے لی ۔ ماضی کے پُر کیف لمحوں اور یہ خواہائے رنگیں کو یاد کر کے کہتے ہیں ۔

یک سرِ صمد گو نہ سودائے نہانے داتم یاد آں روزے کہ من با خود جہانے داتم
 یاد آں رونے کہ دورانہ ماجرا ہائے جہاں ماجراے بانگِ رنکتہ دانے داتم
 یاد آں رونے کہ دستِ افتاں گزشتہ از حرم از غورِ آں کہ من ہم آستانے داتم
 پیچِ پاک از گردشِ گردون گردانم نہ بود کز نہ میں کو چہ ادا آسمانے داتم
 یا آن رونے کہ من از سادہ لوحی ہائے خود باعدوئے گفتہ از دازہ نہانے داتم

شبلیا آں جلوہ نہ نگہائے بمبئی

ہوے موقوفے کہ من خواب گرا نے داتم

بوئے گل میں جس میں ۱۱ اکتوبر سے ۵ نومبر تک کے احساسات نظم
 ہوئے ہیں ۔ نو میدی و تلخ کامی کے کئی لمحے ہیں ۔ شبلی خود مانتے تھے کہ دستِ گل

اور بوئے گل میں جذب و سلوک کا فرق تھا۔ ایک میں جذب و سرستی کے ایام کی داستان ہے اور دوسرے میں سالک راہِ محبت کو جن دشواریوں و نشیب و فراز سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان کا بیان ہے۔ ایک میں بلبلِ نزار داستان کے سامنے پھولوں کا گلہ سن رہا ہے۔ اور دوسرے میں اسے ایسا طر آتا ہے کہ پھول تو جاتے رہے۔ فقط بوئے گل باقی ہے۔ دوسرے مجموعے میں مایوسی اور ناکامی کا کثرت سے ذکر ہے۔ لیکن جس طرح شبلی کی آرزو میں اور اُمیدیں بے ثمر ثابت ہوئیں۔ اسی طرح انتہائی مایوسیاں بھی بلا وجہ تھیں۔ بلکہ ان غزلوں کو لکھے ہوئے ایک مہینہ نہ ہوا تھا کہ انھیں خاص لکھنؤ میں اپنے ممدوح کے خیر مقدم کا موقع ملا۔ شبلی ۲۴ نومبر ۱۹۰۸ء کے ایک خط میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں :-

”بہشتی کا مہمان (راہِ مان) آج کل حسن اتفاق سے یہیں ہے۔ یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جز کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوا ہو گا۔ لیکن بد قسمتی دیکھئے کہ ندوہ کے بد مزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ وقت۔ نہ دماغ۔ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیائے نہ دیکھا ہو گا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیت کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزر رہے ہیں۔ اُردو۔ فارسی۔ انگریزی۔ فرنگ۔ زبانِ دانی۔ مصوری۔ نقشہ کشی۔ پالٹیکس۔ قوتِ تحریر۔ سچا آنچہ عالم ہمہ می داشت تو تنہا داری۔ افسوس غیرت اور محبت کی کشاکش تھی۔ ورنہ آپ بھی وہ دیکھتے جو میں کہتا ہوں۔“

اس کے بعد خطوط میں زیادہ یگانگت اور بے تکلفی آگئی اور شبلی نے اپنی بعض آسان اور قابلِ اعتراض غزلوں کے اشعارِ عطیہ کو تفصیلی شرح

کے ساتھ ار سال کئے۔ اگلے سال انھوں نے چند روز جنجیرہ (مبئی) میں
 مونٹ روڈ پر رہنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ جزیرہ سے جہاں عطیہ کی بڑی
 ہمیشہ نازلی بیگم صاحبہ نواب صاحب سے بیاہی ہوئی تھیں شبلی کو دعوت
 آئی وہ اپنی بیٹی فاطمہ کو سخت بیماری میں مبتلا چھوڑ کر دہلی بمبئی ہونے
 ہوئے جنجیرہ گئے اور کئی دن تک اپنے کمر مغزوں اور دوستوں کے ساتھ
 مقیم رہے۔ اسی زمانے کی اردو غزل ہے۔

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی
 خیال روزہ و فکرِ وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
 جو دودن بھی بسر کر لے گا اس قصرِ علی میں

اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
 ہوائے روح پرور بھی میاں کی نشہ آور ہے
 یہاں فکرے و جام و سبو ہوگی تو کیوں ہوگی

جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
 کسی شے کی جودل میں آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
 کہاں یہ لطف۔ یہ منظر۔ یہ سبزہ۔ یہ بہارستان

عطیہ انتم کو یاد لکھو ہوگی تو کیوں ہوگی
 جنجیرہ سے رخصت ہوئے۔ تو واپس جا کر ایک قطعہ لکھا جس میں
 جنجیرہ کی صحبت ہائے رنگیں کو یاد کر کے کہا ہے۔
 یاد صحبت ہائے رنگیں جو جنجیرہ میں ہیں وہ جنجیرہ کی زیریں تھیں۔ یا کوئی سینجائے

لطف تھا۔ دوقِ سخن تھا۔ صحبتِ احباب تھی مطرب ورد و سرود و ساغر و پیمانہ تھا
 سبزہ نگل سے بھرا تھا دامنِ ہنسار سب غیرتِ خلدِ بریں ہر گوشہ ویرانہ تھا
 غنچہ نگل کا مہتمم تھا۔ ہر اک دم برق ریز عندلیبوں کی زباں پر نالہ مستانہ تھا
 نشہ آور تھی نگاہِ مست ساقی اس قدر خنجرِ بخود لبریز ہے ہر ساغر و پیمانہ تھا
 اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
 مولانا ایک خط میں بھی جزیرہ کی صحبتوں کو یاد کر کے کہتے ہیں۔ ”جزیرہ کا خواب
 بیداری میں بھی نظر آتا ہے۔“ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جنیوہ کا سفر جس کے لئے
 انھوں نے اپنی پیاری بیٹی کو بسترِ مرگ پر دراز چھوڑا تھا۔ ان کے لئے بہت
 مبارک ثابت نہ ہوا اور حرمِ دوست کی کوئی چیز انھیں برابر کھٹکتی رہی۔
 وہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک معذرت آمیز انداز میں جزیرہ کے تعریفی
 قطع کی نسبت لکھتے ہیں کہ یہ اشعار ”آب و ہوا کی لطافت نے اس وقت
 ارتجالاً“ لکھوائے تھے اور یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس سال انھوں نے ممبئی
 اور جزیرہ کے قیام میں کوئی غزل نہیں لکھی۔ مہدی حسن کو ایک خط میں لکھتے
 ہیں ممبئی سے بالکل خالی ہاتھ آیا ایک غزل کا سرمایہ بھی نہ ہو سکا۔ اس شکایت میں
 ایک غزل لکھی۔ وہ بھی وہاں سے نکل کر ”اس غزل کا ایک شعر ہے۔

لے جزیرہ کی تعریفی غزل کی نسبت عطیہ نگیم کی خانہ دانی ڈائری میں ذیل کا اندراج ہے:-
 آخر مولانا شمس صاحب اور شیر حسین قدوائی صاحب یہاں تشریف لائے۔ مدتی
 سے وعدہ تھا مگر بالکل شکریہ اجراء ہوا۔ اکتوبر کے یہاں آئے اور ہفتہ بھر ٹھہرے۔ مولوی صاحب
 یہاں پہنچے ہی چند اشعار اس جاگہ کے متعلق کہے۔ ان کی شاعرانہ طبیعت جوش میں آگئی اور
 یہ غزل کوئی دو گھنٹے کے عرصے میں لکھ کر بھیج دی ہے کسی گویاں خدا..... الخ

داغم کہ بہارِ چین بمبئی اسال

برساتِ پیشینہ جنوں خیز نہ بودہ است!

حقیقت یہ ہے کہ اب وہ وقت آ رہا تھا کہ شبلی کے خوابہائے رنگیں خوابہائے پریشاں ہو جائیں۔ وہ عطیہ یکم کی قابلیت۔ ذہانت۔ وسعت عقول کے معترف تھے اور عطیہ ان کی انشا پر داری اور تصنیفی شہرت کی قدر کرتے تھے۔ لیکن ان کی عمروں اور طبیعتوں میں جو تفاوت تھا وہ کسی پائدار دوستی کے لئے سازگار نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ شبلی اس تفاوتِ عمر کو کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ جب زہرا نے ایک دفعہ شبلی کی صاحبزادیوں کو بہن کہہ کر خطاب کیا تو شبلی نے فوراً انھیں ٹوکا :-

ہاں۔ آپ نے پہلے خط میں صفوی اور فاطمہ کو بہن لکھا ہے۔ عزیزانِ خلق تو قطعی ہے لیکن یہ رشتہ صحیح نہیں۔ حسن صاحب مرحوم زہرا اور عطیہ کے والد (عمراور ہر حیثیت سے میرے چچا تھے۔ اسی لحاظ سے رشتہ قائم ہونا چاہئے بری عمر اس وقت صرف پچاس برس کی ہے اس لئے اتنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں۔

شبلی اور عطیہ میں شاید تیس سال کا فرق تھا۔ ان دونوں کے درمیان خیالات کی ہم آہنگی ہی بڑی مشکل تھی لیکن بعض واقعات بھی ایسے رونما ہوئے جو بادیہ پیمائے محبت کے لئے سنگِ راہ ثابت ہوئے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے عطیہ نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مدرسۃ العلماء کا سنگِ بنیاد ان کی ہمیشہ نازنی میگم سے رکھوایا جائے لیکن ندوۃ کے علماء نے عطیہ یکم کو ہی اپنے جلسوں میں نہیں آنے دیتے تھے۔ وہ ان کی ہمیشہ کے سنگِ بنیاد رکھنے پر کس طرح راضی ہوتے۔ چنانچہ شبلی نے عام مخالفت

اور مولویوں کی برہمی“ کا عذر پیش کیا جو فی الحقیقت بجا تھا۔ لیکن ایک بہت سالہ لڑکی ان پیچیدگیوں کو کیا سمجھے۔ وہ جب خطوں اور نظموں میں شغلی کا وہاہانہ اظہارِ محبت دیکھتی تو ان مصالحت بینوں پر حیران رہ جاتی چنانچہ عطیہ نے مولانا کا عذر تسلیم نہ کیا اور انھیں ”بدتمتی“ کا طعن دیا۔ اس کے جواب میں شغلی نے لکھا :-

تم کہتی ہو کہ میں ”بہت بدتمت“ ہوں۔ میری زندگی کے دو حصے ہیں۔
پرائیویٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا
اندازہ کر سکتیں۔

تم کو کیا معلوم ہے کہ مجھ کو کیا مشکلات ہیں۔ تم کو کیا معلوم ہے کہ میں اگر
عوام کی مرضی کا کسی حد تک لحاظ نہ رکھوں تو ایک نہایت مفید تحریک فوراً
برباد ہو جائے۔

شغلی نے بیگم صاحبہ کے سنگ بنیاد والی تجویز پر تو عمل نہیں کیا لیکن جب
ان کی ہمیشہ نے ندوہ کی امداد کے لئے کچھ رقم ارسال کی تو اس کے تشکیب کا
وظہ لکھ ا۔ اس کا ایک شعر تھا۔

نازم کہ ایں عطیہ فیض امیرہ ایست
کا وازہ سخاش بہ عالم رسیدہ است

بد قسمتی سے لفظ عطیہ کا یہ کنایہ استعمال بھی اختلاف کا سبب بن گیا۔
اور جغیرہ نے نکل کر شغلی نے ایک طویل طویل خط اس کی معذرت میں لکھا۔
اسی زمانے میں رسالہ الندوہ میں مسٹر مشیر حسین قدوائی کا مضمون عورتوں
کی تعلیم کے متعلق شائع ہوا۔ جس پر عطیہ بیگم نے اعتراض کیا۔ اس کے دو تین
ہفتے بعد ناخوشگوار بحث کا ایک اور موقع پیش آیا۔ عطیہ صاحبہ نے اپنے

اپنے کسی خط میں علی گڑھ جانے کا ذکر کیا تھا۔ شبلی کو اس زمانے میں علی گڑھ سے ایک خدا واسطے کا بغض پیدا ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے کچھ ایسے خیالات کا اظہار کیا۔ جنہیں مکتوب الیہ نے علی گڑھ کی بلاوجہ تحقیر سمجھا اور بہت براہم ہوئیں۔

دشمنی نے میری کھویا غیر کو

کس قدر دشمن ہے دیکھا جائے!

چنانچہ اُنھوں نے ایک غضب آلود خط شبلی کو لکھا۔ جس کے جواب میں شبلی نے ۱۳ جنوری ۱۹۱۰ء کو اپنا مفہوم زیادہ واضح کیا اور معذرت چاہی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے دل صاف نہیں ہوئے۔ اب القاب میں ”عزیزی“ کی جگہ ”خالق محترم“ نے لی اور خطوط کالب و لہجہ یک تخت بدل گیا۔ مدت کے بعد، جب ادھر سے ایک شفقت بھرا خط آیا تو شبلی کے تصور نے پھر انگڑائی لی اور دفعتاً بہت سے مردہ خیالات زندہ ہو گئے۔ لیکن یہ سختی عارضی تھی۔ شبلی کے دل میں عطیہ کی یاد ایک لطیف خوشگوار نقش کی طرح محفوظ رہی۔ کبھی کبھی ملاقاتیں بھی ہوئیں لیکن ٹوٹے ہوئے دل پھر جڑ نہ سکے اور دو چار رسمی خطوط کے بعد، خطوط شبلی کا رنگیں باب ختم ہو جاتا ہے۔

۱۹۰۹ء کے آخر میں جب شبلی کو بمبئی کا چشمہ رحمت سراب بنانا نظر آیا۔ تو اُنھوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ مہدی حسن کو اسی خط میں جس میں بمبئی سے خالی ہاتھ آنے کی شکایت کی ہے لکھتے ہیں :-

الہ آباد بلائیے تو آجاؤں لیکن شرط یہ ہے کہ بمبئی کا نعم البدل نہ سہی۔ بلکہ سرا بر تو ہو کیا امید ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد اُنھوں نے کئی خطوں میں الہ آباد اور مرزا پور کی نسبت اشارے کئے۔ لیکن مہدی حسن ٹال گئے۔ اس پر بعض لطیف اشاروں کے بعد مولانا ایک خط میں صاف صاف لکھتے ہیں :-

نچھ کو رنخ تھا کہ اب آپ قابلِ خضب بھی نہیں سمجھتے۔ بمبئی اور الہ آباد دونوں صدائیں بیکار گئیں !

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا یہ چاہتے تھے کہ سلیم مہدی ان سے پردہ نہ کریں۔ ایک خط میں اس کی نسبت لطیف اشارہ ہے۔

آپ تو پردہ نسواں کے مخالف تھے اور اس پر عمل بھی فرمایا لیکن تلافی یہ کہی کہ مودونکو پردہ میں بٹھا دیا۔ اس صورت سے مجھ کو بھی اختلاف نہیں۔ بات ایک ہی ہے۔

ایک اور خط میں ہے :-

واقعی سخت تعجب ہے کہ آپ وعدہ کر کے میزبانی کرنے سے کتر گئے۔ خیر کوئی مصلحت ہوگی۔

مہدی حسن کے نام مولانا کے خطوط میں ایسی مبہم اور معنی خیز عبارتیں لکھی ہیں۔ لیکن آخری خط سے کچھ معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس خط کے بالکل آخر میں کہتے ہیں :-
..... لیکن آپ یا بھادون صاحب ہر دفعہ دامن بچا جاتے ہیں ہم جیسے

نفوس قدسیہ سے پردہ ! اور وہ بھی ساٹھ برس کے بعد !!!

شبلی کے دل و دماغ پر ان دنوں ایک عجیب سی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس کا شفاف ترین اظہار مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کے ان خطوں میں ہے۔ جو مکاتیب شبلی کی پہلی اشاعت میں نہ تھے لیکن دوسرے ایڈیشن میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ آزاد کے نام شبلی کے پہلے دو خط اس زمانے کے

ہیں۔ جب آزاد کی عمر سترہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کے بعد کوئی ساٹھ تین سال کا وقفہ ہے۔ پتہ نہیں۔ اس دوران کے خطوط محفوظ نہیں رہے۔ یا کسی مصلحت کی بنا پر ان کی اشاعت روک دی گئی۔ پہلے دو خط بالکل رسمی رنگ میں ہیں لیکن تیسرا پڑھیں تو عالم ہی اور نظر آتا ہے فرماتے ہیں:-

ازاں بہ درد و دگر ہر دماں گزشتہ
کہ شبوہ ہائے ترا با ہم آشنائی نیست

بھائی! تم نے دانستہ خط و کتابت ترک کر دی ہے کہ ایسا ساحتی لواحتین
لیکن تم رہ رہ کر ایک چر کا لگا دیتے ہو۔ خیر جو مرضی یا یہ بھی منظور!
سکھتے گیا۔ ایک خاص کام تھا۔۔۔۔۔ دھچپیوں کی نئی راہیں نکلیں لیکن صر
چہ خط خضر برد از عمر جاوداں تنہا

اس خط سے یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ بمبئی کی ایک کشش، مولانا ابوالکلام آزاد
کی صحبت تھی۔ جو اس زمانے میں گاہے گاہے بمبئی قیام کرتے تھے۔ ندوہ میں
شبلی کے بعض حریفوں نے انھیں ندوہ سے نکالنے کے لئے دوط طلب
کئے تھے۔ مولانا اس کا ذکر کر کے ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں:-

افسوس ہے کہ ان کے دوط نہیں آئے۔ ورنہ بمبئی میں آکر ٹھکانا ملتا۔
اور خوب صحبت رہتی۔

ایک اور خط میں ہے:-

میں آج بمبئی جا رہا ہوں۔ گو آپ کے بغیر وہ دیرانے سے بدتر ہے۔
دسمبر ۱۹۰۹ء میں ابوالکلام آزاد، شبلی سے کسی بات پر کشیدہ خاطر ہو
مولانا انھیں ایک مختصر خط میں لکھتے ہیں:-

میں سمجھتا تھا کہ آپ نے میری نیاز مندی کو تسلیم کر لیا ہے لیکن جبہ طلبی کے آرام

سے ثابت ہوا۔ صر خود غلط بود الخ۔ یہ بھی بار بار لکھنے کی بات تھی؛
اگلا خط فقط ایک شعر پر مشتمل ہے۔

دوسرے روزے است کہ دُرِ دیدہ نگہ ویں عجب است

نہ ثوابے ز من آمد، نہ گناہے گا ہے !

شبلی نے ابوالکلام آزاد کے نام کئی خطوں میں انہار مدعا فقط ایک
شعر یا ایک مصرعے تک محدود رکھا ہے۔ ایک ”خط“ ہے۔

شراب لطف پر درجام ہے کردی دے گفتم

کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

ایک اور ”خط“ فقط ایک مصرعے تک محدود ہے۔ لیکن ملاحظہ کیجئے کہ اولیٰ
مطلب کے اس بادشاہ نے ایک قطرے میں شکائتوں اور آرزوؤں کے
کتے دریا بھر دئے ہیں۔ لکھتے ہیں :-

اس قدر ناسی ارباب وفا ہو جانا !

ان دونوں شبلی کے تعلقات اپنے رفقاءے کار سے بہت بگڑ گئے تھے اور

وہ انھیں ندوہ سے نکالنے کے درپے تھے۔ مولانا کے خلاف جو الزامات
لگائے جاتے تھے۔ ان میں ابوالکلام آزاد کی محبت بھی تھی۔ شبلی ان الزامات
کی فہرست دے کر ایک خط خود آزاد کو لکھتے ہیں :-

ہاں انھیں جرائم میں ابوالکلام آزاد کی محبت بھی ہے !

کرنل عبد المجید خاں کی دستگیری سے مولانا کی علیحدگی کی تحریک تو کامیاب
نہ ہوئی لیکن ابوالکلام آزاد سے ان کے تعلقات میں اُتنا چرچا نہ ہوا۔
اور انھیں کئی معذرت آمیز خط لکھنے پڑے۔ ۱۸ اگست ۱۹۱۷ء کا ایک

خط ہے :-

برادر عزیز -

آپ کا لہجہ اگرچہ اب تک نہیں بدلا لیکن بخدا یہ اُمید قائم ہے کہ کلکتہ پہنچوں گا تو آپ سخت دلی سے کام نہ لے سکیں گے اور ظاہری طور سے بھی لیکن وہی قدیم عنایتیں پھر سنبھول ہوں گی اور میرے لئے اسی قدر کافی ہے۔ پھر وہ مجاز رفتہ رفتہ حقیقت بن جائے گا۔

ان سب باتوں کے ساتھ یہ تسلیم کرتا ہوں اور نہ امت سے منفعل ہو جاتا ہوں کہ جرم سخت ہے بلکہ سخت سے سخت تر لیکن جس سے معاملہ ہے اس کا دل بھی اسی قدر نرم بلکہ نرم تر ہے۔ اس لئے جراتِ معذرت قائم ہے اور ہے گی۔

نہ یہ اُمید پوری نہ ہوئی اور شبلی کو ایک اور معذرت کا خط لکھنا پڑا۔ آپ کا کارڈ پہنچا۔ مجھ کو بڑی شکایت آپ سے تلوں مزاجی اور عدم استقلال کی تھی۔ باسے اس مرتبہ آپ اپنی ناراضی میں پورے مستقل رہے۔ اور اب تک ہیں۔

بخت بد ہیں کہ شبلی نہ کند غیر حیف نیک خوئے کو فارانہ جفا شناسد مولانا ابوالکلام آزاد کے نام شبلی کے خطوط میں فقط زانو نیاز گلے شکوے اور معذرت خواہیاں نہیں۔ بعض بڑے پتے کی باتیں اور کارآمد نصیحتیں بھی ہیں۔ آزاد نے ایک زمانہ ندوۃ العلماء میں شبلی کی صحبت میں گزارا تھا۔ مذہبی اصلاح اور سیاسی معاملات میں دونوں ہم خیال تھے۔ شبلی کا جن نوجوانوں کی ذہنی تشکیل میں ہاتھ تھا۔ ان میں سب سے ذہین اور ابوالعزم ابوالکلام آزاد تھے۔ اور یہ ظاہر تھا کہ شبلی کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے ان سے زیادہ سونوں کوئی نہیں چنانچہ شبلی نے مسلسل کوشش

کی کہ اس نوجوان کی ذہنی اور علمی تربیت اس طریقے پر کی جائے کہ اسے اپنا کام پورا کرنے میں مشکلات کا سامنا نہ ہو۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کو غزل گوئی کا شوق تھا اور شروع میں وہ کثرت سے کلکتے کے مشاعروں میں غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ شبلی اس کی نسبت، بڑے ادب سے، لیکن بڑی وضاحت کے ساتھ، کلکتہ سے واپس آکر، انھیں لکھتے ہیں:-

آپ کی سخن سرائی پر بار بار ٹوکنے کو جی چاہتا تھا کہ مرض میں افتادہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس قدر گستاخی نہ ہو سکی۔ بہر حال کچھ دن زبانِ سعدی در کام نہ رہی چاہئے۔ ایک اور خط میں ہے:-

آپ کو اب زیادہ مولویت کی صورت میں رہنا چاہئے۔ اس سے اچھے اچھے کام لے سکتے ہیں۔

نکتہ چیں کہیں گے کہ آخری فقرے نے، ابوالکلام آزاد نہیں، تو کم از کم شبلی کی مولویت کی قلعی کھول دی ہے۔ لیکن شبلی نے آزاد کو جو نصیحت کی تھی۔ کیا وہ ان کے فائدے کی نہ تھی؟ اور کیا سید سلیمان کا یہ بیان غلط ہے کہ یہ شبلی کا فیضِ صحبت تھا جس نے ابوالکلام آزاد کو مولوی ابوالکلام آزاد بنا دیا؟

ندوة العلماء لکھنؤ

(۲)

۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک

بمبئی اور کلکتہ کی دھچپیاں شبلی کے لئے بلا کی کشش رکھتی تھیں لیکن ندوہ کی کشش اس سے زیادہ تھی۔ شبلی کو اگر عطیہ اور زرہرا کی صحبت اور بمبئی اور کلکتہ کے خوشنما مناظر سے تعلق خاطر تھا تو اس مجموعہ اعضاء کو اپنی قوم اور مذہب اور اپنے علمی و ادبی مشغلے ان سے بھی زیادہ عزیز تھے۔ وہ بمبئی یا ججپورہ جاتے۔ تب بھی ان کا معمول تھا کہ اپنے عزیز اور حسین میزبانوں سے اس وقت ملتے۔ جب صبح صبح اپنے ”وظیفہ علمی“ سے فارغ ہو جاتے۔ چنانچہ شبلی کی رنگبین دھچپیوں سے ان کے قومی کاموں میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ ان کی سب سے زیادہ قومی مصروفیت کے یہی دن تھے۔ شبلی کی غیر معمولی احتیاط کی جگہ بندگانِ قومی کم ہو رہی تھی اور جس ذوق و شوق سے وہ فارسی غزلوں میں اپنا دل کھول رکھ رہے تھے۔ اسی جوش و دلولے سے قومی کاموں میں ہاتھ مار رہے تھے۔

ندوہ کی تاریخ میں ۱۹۰۹ء کا سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سال صوبہ کے گورنر نے دارالعلوم کی وسیع عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور حکومت کی طرف سے ندوہ کو بعض مقاصد کے لئے پانچ سو روپے ماہوار کی امداد مقرر ہوئی۔

لیکن اس گراں قدر امداد سے بعض انجمنیں بھی پیدا ہوئیں۔ ندوہ کی باقی آمدنی دوسو روپے سے بھی کم تھی اور یہ پانچ سو فقط غیر مذہبی تعلیم کے لئے تھے۔ اس امداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مذہبی تعلیم کا پلہ بھاری ہو گیا اور ندوہ زیادہ تر ایک غیر مذہبی مدرسہ ہو گیا۔ اب مولانا کو اس صورت حالات کی اصلاح کی فکر ہوئی۔ اس وقت بھوپال میں مولانا کے ایک دلی بیواہ اور ندوہ کے سچے محسن مولوی محمد امین زبیری حضور یکم بھوپال کے لٹریٹری سکریٹری تھے۔ مولانا نے انھیں خط لکھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ندوہ کی مستقل آمدنی ابھی تک صرف دوسو روپے گورنمنٹ نے پانچ سو روپے اسلئے اب تقاضا مذہبی علوم کا صیغہ اس کے مقابلے میں بہت کم وقت رہ جاتا ہے۔ ضرور ہے کہ خود ندوہ کی آمدنی میں اضافہ ہو۔

مولوی محمد امین نے یہ صورت حالات حضور یکم صاحبہ کی خدمت میں عرض کی۔ جنھوں نے بھوپال کی سابقہ امداد (پچاس روپے) میں دوسو روپے ماہوار کا اضافہ کر دیا۔ اسی طرح رام پور سے بھی پانچ سو روپے سالانہ ملنے شروع ہوئے اور جب سال ۱۹۱۷ء میں ہنربائی نس آغا خاں ندوہ تشریف لائے۔ تو انھوں نے بھی پانچ سو روپے سالانہ کی امداد منظور کی۔

ندوہ کے مالی استحکام کے علاوہ شبلی نے اس کی عام شہرت اور مقبولیت پر توجہ کی۔ انھوں نے ندوہ کے ایک بالکل ابتدائی اجلاس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ علما ندوہ کے پلیٹ فارم پر متحد ہو کر قومی معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے تعلیمی مشغلوں کے علاوہ بعض دوسرے کاموں میں بھی ہاتھ ڈالا۔ اور ان معاملات میں ندوہ کو قوم کی آواز بنانا چاہا۔ ان میں سے ایک مفید کام قانون وقف علی الاولاد تھا جس کا سلسلہ سب سے پہلے سرسید نے شروع کیا تھا لیکن اس وقت قانون دان اس کے خلاف

تھے۔ اس کے بعد سید امیر علی نے پہلے ہائی کورٹ کلکتہ میں کرسی عدالت پر بیٹھ کر (۱۸۹۴ء) اور پھر لندن کے ایک انگریزی رسالے میں اس مسئلہ کے حق میں وہ مضبوط دلائل پیش کیں جنہوں نے قانونی اعتراضات کی ٹھوس رکاوٹ کو بہت حد تک دور کر دیا۔

جس وقت سرسید نے اس مسئلے کو اٹھانا چاہا۔ اس وقت مولانا علی گڑھی تھے اور سرسید کی کوششوں سے بے خبر نہ تھے۔ سید امیر علی کے فیصلے اور مضمون کے بعد انہیں جرات ہوئی کہ اس مسئلے کو نئے سرے سے اٹھائیں اور حکومت کو آمادہ کریں کہ سید امیر علی کے فیصلے کے مطابق وقف الاولاد کا قانون بنائے۔ اس کے علاوہ مسٹر محمد علی جناح نے ۱۹۰۶ء کے اجلاس کانگریس میں اس مسئلے پر پُر زور تقریر کی۔ اب مولانا شبلی کا راستہ صاف تھا۔ انہوں نے ندوہ کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۰۷ء میں اس کے حق میں ریزولوشن پاس کرایا اور پھر اس کی تکمیل کے لئے نہایت سرگرم اور باقاعدہ کوششیں شروع کیں۔ انہوں نے اس کام کے لئے ندوہ کے زیر حمایت ایک مجلس وقف قائم کی اور ملک میں اس کی تائید میں جا بجا جلسے کرائے لیکن اس مسئلے کا حل گورنمنٹ نے نہ کیا۔ بلکہ مسٹر محمد علی جناح نے اسے کامیابی کے زینہ تک پہنچانے کے لئے اصل عملی قدم اٹھایا۔ اس وقت ملک میں منٹو مارلے سکیم کے مطابق ہیمیلٹون کونسل بن چکی تھی جسے وضع قوانین کا تھوڑا بہت اختیار تھا۔ مسٹر جناح اس کونسل کے ممبر تھے۔ انہوں نے حکومت سے اس مسئلے پر استفسار کیا اور جب انہیں تیرہ چلا گئے حکومت اس مسئلے کے حق میں قانون بنانے کو تیار نہیں لیکن اگر کوئی پرائیویٹ ممبر بل پیش کرے گا۔ تو اس پر گورنمنٹ غور کرے گی۔ تو انہوں نے خود وقف الاولاد بل کونسل میں پیش کیا جو تھوڑے سے تغیر و تبدل کے بعد منظور ہو گیا۔

قانون وقف الاولاد کے نفاذ میں بہت سے مسلمانوں کی کوششوں کو دخل تھا۔ بلکہ جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے اس میں سید امیر علی اور سید محمد علی جناح کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ لیکن عام مسلمانوں میں اس کے حق میں تحریک پیدا کرنے میں یقیناً سب سے زیادہ دخل مولانا بشلی کو تھا اور اس تحریک کی وجہ سے مردودہ قوم کے ان حلقوں کے سامنے بھی آگیا۔ جنہیں علمی معاملات کیساتھ خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس تحریک کے ساتھ ساتھ مولانا نے مردودہ ہی سے اشاعت اسلام کی تحریک کو چلانا چاہا۔ ۱۹۰۷ء میں آریہ سماج کی کوششوں سے راجپوتانہ اور نواح دہلی و آگرہ کے کئی مسلمان راجپوت، جن میں بہت سی ہندوانہ رسوم جاری تھیں۔ دوبارہ ہندو ہونے پر آمادہ ہوئے۔ مسلمانوں میں اس خبر سے بڑا ہیجان پھیل گیا۔ کرنیل عبد المجید خاں نے، جو خود مسلمان راجپوت تھے۔ ۱۹۰۷ء میں پٹیالہ میں ایک مسلمان راجپوت کانفرنس منعقد کی اور مولانا کو بھی دعوت دی۔ مولانا اس کانفرنس میں اپنے اور مردودہ کے ایک بڑے محسن کی خوشی کے لئے کسی قدر احساسِ مجبوری کے ساتھ شریک ہوئے۔ لیکن یہی شرکت مسئلہ اشاعت اسلام میں ان کی غیر معمولی دلچسپی کا باعث بن گئی۔ یہاں سے واپس جا کر انھوں نے ”نومسلم راجپوت اور اسلام“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ جس میں اگرچہ زیادہ زور ایک مذہبی تعلیم کی وسیع الشان درس گاہ (یعنی مردودہ) کی اہمیت اور ضرورت پر تھا۔ لیکن اس میں اشاعت اسلام کی ضرورت پر بھی بحث تھی۔ اس کے بعد وہ زیادہ شوق سے اس مسئلہ پر متوجہ ہوئے۔ اشاعت اسلام کی انہیں بنائی گئیں۔ رپورٹیں تیار ہوئیں۔ اپیلیں شائع ہوئیں۔ مردودہ کو اشاعت اسلام کا مرکز قرار دیا گیا۔ لیکن ان سب کا رد ایسوں کا ذرہ بھر نتیجہ نہ نکلا۔

اس کی پہلی وجہ تو ندوہ کے اراکین کا اختلاف تھا۔ پھر مولانا کی اپنی حالت ”یک سرو ہنر اسودا“ والی ہو رہی تھی اور ان کی صحت اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ ندوہ اور تصنیفی کاموں کے علاوہ کوئی تیسرا اہم کام ہاتھ میں لیں۔ اس کے علاوہ جب وہ سیاسیات میں کود پڑے اور کانگریس اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی بن کر سیاسی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے تو شاید سیاسی مصلحتیں بھی اس کے خلاف تھیں کہ وہ ایک ایسی تحریک کی قیادت کریں جس سے ہندو مسلم تعلقات کا بگڑنا ناگزیر نہ تھا چنانچہ ان کا سارا جوش

لے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہندوئی معاملات میں جو تلخ گھونٹ پیئے پڑتے ہیں۔ ان کا نہ تو شبلی کے رفیق کار مولانا ابوالکلام آزاد نے بالکل اسی زمانے میں دیا۔ جس طرح بعض مسلمان راجپوتوں میں ہندوؤں کی بہت سی باتیں ہیں۔ اسی طرح پنجاب میں مشہور باطنی داعی شمس الدین ملتانی کے وقت سے کئی لوگ ایسے ہیں۔ جو بظاہر ہندو اور بہاؤن اسماعیلی ہیں۔ ۱۲-۱۹۱۰ء میں جب آریہ سماج نے نیم مسلم راجپوتوں کو ہندو بنانے کو شمش کی۔ تو ساتھ ساتھ انھوں نے ان اسماعیلیوں میں بھی اپنا پرچار شروع کر دیا۔ اس پر ہنر ہائی نس آغا خاں نے انھیں حکم دیا کہ وہ اسماعیلی مسلمان ہونے کا اعلان کر دیں۔ اس پر فریقین میں جو کشمکش شروع ہوئی۔ اس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد اپنے مشہور اخبار الامال میں لکھتے ہیں:-

لیکن ہم اپنے ہندو آریہ معاصرین کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ اس تحریک کو مفید سمجھتے ہیں۔ تو شوق سے جاری رکھیں۔ اگر تمام اسماعیلی ہندو، ہندو مذہب اختیار کر لیں۔ جب بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں..... مسلمانوں کی بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ تعداد کی قلت و کثرت کے (باقی اگلے صفحہ پر)

ٹھٹھکرہ گیا۔ مسئلہ اشاعتِ اسلام میں انھیں جس طرح کامیابی ہوئی۔ اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے ۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں کی۔ فرماتے ہیں :-

”دو سال ہوئے کہ شاہجہاں پور سے ایک خط میرے پاس سفید خان سوداگر کا آیا کہ شاہجہاں پور سے آٹھ کوس پر ایک گاؤں ہے جمال پور۔ وہاں کے رئیس راجپوت جو مسلمان ہیں۔ وہ ہندو ہونا چاہتے ہیں۔ آریہ وہاں پہنچ گئے ہیں۔ ان کو ہندو کرنا چاہتے ہیں۔ آپ جلد آئیے اور مدد کیجیے۔ انھوں نے اس کے ساتھ ہی دہلی کی انجمن ہدایت الاسلام کے مولانا عبدالحق حقانی کو لکھا تھا۔ وہ وہاں سے تشریف لائے تھے اور میں ندوہ سے گیا۔ جس وقت میں یہاں سے چلا ہوں۔ میری جو حالت تھی یہ طلبہ ندوہ کے جو یہاں بیٹھے ہیں وہ اس کے شاہد ہوں گے کہ میں نے اس وقت کوئی گالی نہیں اٹھا رکھی تھی۔ جو میں نے ان ندوہ والوں کو نہ سُنا ہی ہوگی کہ اے بے حیاء اور اے کم بختو! ڈوب مرو۔ یہ واقعات پیش آئے ہیں۔ ندوہ کو آگ لگا دو اور علی گڑھ کو

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

چکر میں پڑ گئے ہیں۔ تعداد کو قوی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دلوں کو قوی نہیں کرتے۔

حالانکہ اسلام کی فطرتیں تعداد کوئی پچیز نہیں.....

جو جاتے ہیں۔ ان کو جانے دو۔ وہ پہلے ہی کون سے مسلمان تھے کہ

اب ان کے ہندو ہو جانے کا ماتم ہو.....“

شبلی نے ہندو مسلم اتحاد کی خواہش میں مسلمان بادشاہوں کے خلاف میزانِ عدل کے ایک پتے کو جس طرح جھکا دیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

بھی پھونک دو! یہی الفاظ میں نے اُس وقت کہے تھے اور آج بھی کہتا ہوں۔ اس وقت نہایت افسوس میں میں یہاں سے گیا تھا۔ وہاں جا کر میں نے پوچھا کہ کیا واقعہ ہے۔ لوگوں نے یہ بیان کیا کہ آریہ اس گاؤں میں آئے ہوئے ہیں اور وہ گاؤں کے نو مسلم راجپوتوں کو ہندو بنا چاہتے ہیں۔ مسلمان علماء کو بلایا ہے۔ جمال پور سے ایک کوس پر خیمہ کھڑا کیا گیا ہے۔ تین سو روپے کھانے میں صرف ہوئے ہیں۔ چندہ وغیرہ کیا گیا ہے۔ وہ نو مسلم بچارے یہ کہتے تھے کہ مناظرہ ہم جانتے نہیں۔ پڑھے لکھے نہیں۔ آپ ہمارے گاؤں میں آئیے اور یہاں آکر ہم کو سمجھائیے۔ جو باتیں ہمارے دل میں ہوں گی ہم آپ سے کہیں گے۔ آپ ان کا جواب دیکھئے۔ پھر جو کچھ بھی ہو۔ یہ واقعہ ہے۔ اس میں ذرا بھی غلط نہیں کہتا ہوں۔ اس کے شاہد وزیر حسن صاحب وکیل شاہجاں پور ہیں۔ وہ اس کی گواہی دے سکتے ہیں۔ اس پر ایک شخص بھی راضی نہ ہوا کہ گاؤں میں جائے۔ اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ لوگ خدا خواستہ فوجداری کریں گے یا ماریں گے۔ کیونکہ پولیس اور تحصیلدار وہاں موجود تھے کہ امن و امان قائم رہے۔ میں نے بالآخر یہ کیا کہ بھائی مجھے تو پاکی میں ڈال کر وہاں لے چلو۔ میں چلتا ہوں لیکن کوئی شخص نہیں لے گیا۔

غرض تین دن تک میں وہاں پڑا رہا۔ بالآخر ان لوگوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم ہندو ہیں۔“

ان کاموں اور اسکیموں کے ساتھ مولانا کے تصنیفی مشغے برابر جاری تھے۔ متفرق مضامین اور کتب کی غزلیات کے علاوہ اس زمانے کی مستقل تصنیف شعر العجم ہے۔ جو ۱۹۰۶ء میں شروع ہوئی۔ اور ۱۹۰۹ء میں

پایہ اختتام کو پہنچی۔ شعراِ اعجم کی مختلف جلدیں مختلف زمانوں میں شائع ہوئیں۔
 حتیٰ کہ آخری جلد مولانا کی وفات کے بعد پریس سے آئی لیکن ۱۹۱۰ء تک
 پہلے تین حصے چھپ چکے تھے اور پنجاب یونیورسٹی نے اسے سال کی بہترین
 تصنیف قرار دے کر مؤلف کو پندرہ سو روپے کا انعام دیا۔

حال میں تنقید شعراِ اعجم کے نام سے علامہ حافظ محمود خاں شیرانی کے وہ
 مضامین بہ اضافہ توضیح شائع ہوئے ہیں۔ جو پہلے انجمن ترقی اردو کے رسالہ اردو
 میں شائع ہوئے تھے۔ علامہ شیرانی، شاید دورِ حاضر میں اردو اور فارسی
 ادبیات کے سب سے زیادہ مھوس اور جتید عالم ہیں۔ اور ان کے مضامین
 پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ قدیم علما میں کیسے کیسے گوہر ہائے شتِ جمراغ
 موجود ہیں۔ جن علوم سے انھیں ربط ہے ان کے مطابق ان کی معلومات کا
 کوئی ٹھکانہ نہیں۔ بلکہ ان کی بڑی تیز ہے تلاشِ واقعات میں تساہل،
 یا خیالات میں جھول، ان کے نزدیک ایسے جرائم ہیں۔ جن کا کوئی کفارہ نہیں۔
 قدرتی بات ہے کہ جن چیزوں کو عام علما اپنی دسترس سے بہت بالا سمجھتے
 ہیں۔ وہ بھی علامہ شیرانی کے بلند معیار پر پوری نہیں اترتے۔ چند سال
 ہوئے۔ ناگپور کے شمس العلماء پروفیسر عبدالغنی نے مغلوں سے پہلے کی فارسی
 ادبیات پر ایک ضخیم کتاب شائع کی تھی۔ اس پر علامہ شیرانی نے رسالہ اردو
 میں کوئی سو صفحے کا ریویو بھی لکھا۔ کوئی بھی انصاف پسند یہ ریویو پڑھ کر یہ نہیں
 کہے گا کہ علامہ کا ریویو اصل کتاب سے دو چند قدر و قیمت کا نہیں کہاں
 پروفیسر عبدالغنی کی عامیانہ معلومات، جو فقط چند مشہور اور مطبوعہ کتابوں
 کا خلاصہ تھیں۔ اور کہاں علامہ شیرانی کا ذخیرہ علمی، جن کی قطر سے ملک
 کی کسی لائبریری کی کوئی قلمی کتاب نہیں چھپی۔ اور جن کا ذاتی کتب خانہ،

حجم میں نہ سہی، لیکن قدر و قیمت کے لحاظ سے، ایک دولا بُر یوں کو چھوڑ کر ملک کے سب سے مشہور کتب خانوں کے بالمقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس پر نقطہ نظر اور نگہ تنقید کا فرق۔ کہاں پروفیسر عبدالغنی، جو ہر لکھے ہوئے حرف کو، بغیر کسی شک اور سوال کے قبول کر لیں اور کہاں شیرانی، جو ایک ایک حرف کو، ایک ایک فقرے کو اس طرح جانچیں۔ جس طرح ایک ہر فن مقنن ایک دستاویز کی عبارت کو دیکھتا ہے۔ علامہ شیرانی نے بلا مبالغہ پروفیسر عبدالغنی کی کتاب کو تہس نہس کر دیا ہے۔ انھوں نے جو ضرب لگائی ہے۔ ہتھوڑے کی ضرب ہے۔ بر محل۔ قاطع۔ مسکت۔ دندان شکن اور پروفیسر صاحب کو مزور افسوس ہو گا کہ انھوں نے ایک ایسی عامیانہ کتاب لکھ کر ان ماہران فن کو کیوں اُکسایا۔ جو کچی اور ادھوری کوششوں کو علم و فن کے خلاف ایک جرم سمجھتے ہیں۔

یہی عمل علامہ شیرانی نے آج سے چند سال پہلے علی گڑھ کے پروفیسر محمد صلیب کی مرتب کردہ خزانۃ الفتح کے ساتھ کیا تھا اور دکھایا تھا کہ خواہ ہمارے روشن خیال پروفیسر کیسی ہی شیریں اور بامحاورہ انگریزی لکھ لیں اور خواہ ان کی ذاتی خوش اخلاقی اور خوش معاشی کا کیا عالم ہو، لیکن جہاں تک علم و فن کی کٹھن منزلوں کا تعلق ہے۔ صحت بیان۔ معلومات فنی چنگی اور لفظی احتیاط میں وہ ہمارے قدیم اساتذہ فن سے بہت پیچھے ہیں!

شیرانی نے شعر العجم پر جو تنقید کی ہے۔ وہ بھی اسی طرز اور پائے کی ہے۔ علامہ شبلی بھی ایک بختہ کار عالم تھے لیکن انھوں نے کام کا آغاز کیا تھا اور ظاہر ہے۔ وہ اسے انتہا تک نہ پہنچا سکے۔ انھیں وہ سہوہ میسر نہ تھیں۔ جو بعد کے عملا کو حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ادیب اور

شاعر پہلے تھے۔ نقاد اور مورخ بعد میں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی کتاب میں کئی ایسی چیزیں رہ گئی ہیں۔ جو ان نگاہوں میں کھٹکتی ہیں جنہیں طرزِ ادا کی شستگی سے پہلے صحتِ بیان کی تلاش ہوتی ہے۔ شبلی پر سید شہرانی کے اکثر اعتراضات بجا ہیں لیکن انھوں نے ایک بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ شبلی کا مقصد ہندوستان میں فارسی شاعری کا مذاق پیدا کرنا یا بوجھل رکھنا تھا۔ اس میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے کئی جگہ دولتِ شاہِ سمرقندی اور دوسرے دلچسپ مگر غیر محتاط راویوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا ہے اور واقعات کا بیان کرتے ہوئے، ان پر کئی جگہ تیز نگہ تنقید نہیں ڈالی لیکن جیسا کہ علامہ شبیرانی نے خود اعتراف کیا ہے ”فارسی نظم کی تاریخ و تنقید پر فارسی اور اردو میں اب تک جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ شعرِ انجم ان میں بغیر کسی اشتیاق کے بہترین تالیفات مانا جاسکتی ہے۔“ فارسی شاعری کی تاریخ میں اس کتاب کا وہی مرتبہ ہے جو اردو شاعری کی تاریخ میں آبِ حیات کا۔ اور اس کتاب نے ہندوستان میں فارسی شاعری کا مذاق بڑی حد تک دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔

اپنی نقانیت کی نسبت ایک جگہ شبلی نے لکھا تھا کہ انھیں ان میں انفاق سب سے زیادہ عزیز تھی اور فی الواقع اس کتاب کا مرتبہ ہمارے ادب میں بہت بلند ہے۔ شبلی کی نقانیت میں سب سے زیادہ قبولیت عامہ اسی کو نصیب ہوئی ہے لیکن شاید اس کی نسبت یہ کہا جاسکے کہ اس کی مقبولیت کا سبب فقط کتاب کی ادبی اور فنی خوبیاں نہیں بلکہ جن ولولہ انگیز واقعات کا اس میں بیان ہے۔ انھوں نے کتاب کو بالخصوص اس کے نصفِ اول کو مسلمانوں کے لئے ایک ضیافتِ دل و دماغ بنا دیا ہے۔ عہدِ فاروقی کے

واقعات اور ایران و روما کی قدیم اور پر شکوہ بادشاہتوں کے خلاف مسلمانوں کی بہیم فتوحات، ایک اہل قلم کو ایسا مضمون بہم پہنچاتی ہیں۔ جسے سرسبز کرنا مشکل نہیں۔ ہمارے ادب میں اور کئی اہل قلم نے ان واقعات کو بیان کیا ہے (اور اگرچہ شبلی کا انداز تحریر کسی میں نہیں) لیکن یہ واقعات ہی ایسے ہیں کہ اگر انھیں راشد الخیری کی ماہِ عجم میں، بلکہ منشی غلام قادر فصیح کی تاریخ اسلام میں بھی پڑھیں۔ تو طبیعت کو ایک خاص فرخت محسوس ہوتی ہے الفاروق کی مقبولیت میں اس کے موضوع کو بھی بڑا دخل ہے۔ اور ہمارے خیال میں شبلی کی تصانیف میں شعرا لعم کا مرتبہ بھی الفاروق سے کم نہیں۔ بلاشبہ موضوع یہاں بھی خوشگوار ہے۔ (اور جیسا کہ مولانا شروانی نے ایک جگہ لکھا شبلی کی کامیاب انشا پردازی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ زیادہ تر ریزر سینوں میں تخم ریزی کرتے تھے لیکن پھر بھی ریسرچ اور تنقید کی ایک کتاب کو ایک کڑے علمی معیار سے بہت نیچے آئے بغیر شگفتہ اور تحسپ بنا دینا فقط ایک کامل انشا پرداز کا کارنامہ ہے !

جن دنوں شبلی شعرا لعم لکھ رہے تھے۔ اس وقت ان کا دل و دماغ چین بمبئی کی ہواؤں سے معطر رہتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقط دستِ گل میں ہی نہیں بلکہ شعرا لعم میں بھی ”خمارِ حشم ساقی“ ملا ہوا ہے اور یہ فقط ان دنوں کی تھیس نہیں بلکہ اس دور ان میں شبلی نے جو کچھ بھی لکھا اس سے ایک خاص طرز کی نفاست، حسن بیان اور شائستگی ٹپکتی ہے۔ شبلی کے مضامین عالمگیر ناظرانہ قسم کے تاریخی مضامین ہیں۔ فقط تصور کا ایک رخ نمایاں کرتے ہیں اور خالص تاریخی نقطہ نظر سے ان پر کئی بجا اعتراض ہو سکتے ہیں لیکن انھیں پڑھئے۔ ان کے طرزِ تحریر پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ایک کامل الف

اُستاد کے ہاتھ میں رسی رتج اور تحقیق کے سنگریزے کس طرح شگفتہ پھول بن جاتے ہیں!!

شعرا انجم کے علاوہ شبلی کی اس زمانے کی ایک دلچسپ تالیف لاتعداد ہے۔ جس میں انھوں نے عربی زبان میں جرجی زیدان کی تمدن اسلامی کی تاریخ کا رد لکھا ہے۔ جرجی زیدان اس زمانے کا ایک مشہور ادیب اور مورخ تھا۔ اس نے پانچ جلدوں میں ایک ضخیم تاریخ تمدن اسلامی لکھی تھی جس میں مختلف مباحث سے تفصیلی طور پر بحث کی گئی اور ایک باب میں مولانا شبلی کے کتب خانہ اسکندریہ والے مشہور مضمون کی بھی تردید کی تھی۔ جرجی زیدان سے مولانا کے تعلقات تھے۔ ان کے اپنے مضامین اس کے رسالہ اہلال میں شائع ہو چکے تھے لیکن اس نے اپنی تاریخ میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کئی باتیں ایسی لکھی تھیں جو مولانا کی حمیت قومی نہ گوارا تھیں مصر کے کئی علماء کو بھی ان باتوں کے جواب کا خیال آیا لیکن کسی کو تکمیل کار کی توفیق نہ ہوئی۔ مولانا نے یہ کام اپنے ذمے لیا اور بڑی محنت اور اہتمام سے ۱۹۱۷ء کی برسات میں ختم کیا۔ ان دنوں رمضان کا مہینہ تھا۔ برسات کی اس اور جس اس پر مستزاد۔ مولانا اسی حالت میں کتابیں دیکھتے اور حوالے ڈھونڈتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آنکھ میں پانی اُتر آیا اور بینائی میں ضعف آگیا۔ لیکن اسلام کے اس شہید ائی نے اپنا کام ختم کر کے چھوڑا۔ نومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں :-

تمدن کے رد میں ابتداءً ایک ہفتہ میں اس قدر اہتمام رہا کہ ایک آنکھ میں

پانی اُترتا محسوس ہوا۔ اور اب اس سے حرف نظر نہیں آتے۔ ایک آنکھ جو صحیح ہے

اس پر بھی بہت بار معلوم ہوتا ہے اب لکھنا پڑھنا بالکل کم ہو گیا ہے

جرجی زیدان کی کتاب کا رد لکھنے کے بعد مولانا اپنی زندگی
تصفیفی ہم پر متوجہ ہوئے۔ رسول اکرمؐ کی سوانح حیات انھوں نے سلاہ
میں لکھنی شروع کی تھی لیکن وہ اپنی تصنیف پر مطمئن نہ ہوئے۔ اور کتاب
بانیہ تکمیل کو نہ پہنچی۔ اس کے بعد جب وہ ۱۹۰۶ء میں بڑودہ گئے تو مولانا
محمد علی نے ان سے مارگو لیتھ کی کتاب کا رد لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جس نے
کتب احادیث سے رسول اکرمؐ کی زندگی کے متعلق بڑے معاندانہ اور ذہرنا
نائج استنباط کئے تھے۔ اور ۱۹۰۷ء میں آنحضرتؐ کی ایک نہایت مخالفانہ
سوانح حیات لکھی تھی۔ مولانا اس وقت شعرا لعم کی تالیف میں مصروف
تھے۔ اس لئے معاملہ التوا میں پڑ گیا جب وہ اس سے فارغ ہوئے اور
بعض دوسرے واقعات کی بنا پر بھی انھیں کتاب کی ضرورت زیادہ
محسوس ہوئی تو انھوں نے ۱۹۱۲ء کے آغاز میں سیرت نبویؐ لکھنے کا
مصمم ارادہ کیا اور جنوری ۱۹۱۲ء کے اندر وہیں اس کا اعلان کر دیا۔
مولانا کا ارادہ ایک نہایت مفصل کتاب لکھنے کا تھا۔ جس میں رسول اکرمؐ
کی زندگی کے متعلق تمام مواد نگہ تنقید سے پرکھا جائے اور مغربی نکتہ چینیوں
کے تمام اعتراضات کا جواب ہو۔ اس کے لئے بہت سی نایاب اور
قلبی کتابیں درکار تھیں۔ مغربی مصنفین کی کتابوں کا ترجمہ بھی ضروری
تھا۔ چنانچہ مولانا نے اس کام کے ماہانہ مصارف کے لئے ڈھائی سو روپے
ماہوار اور خرید کتب کے لئے کچھ نقد روپے کی درخواست کی۔ مولانا کا
ارادہ ایک مجلس تالیف سیرت قائم کرنے کا تھا۔ جس کے ارکان روپے
سے یا دوسرے طریقوں سے مدد کریں لیکن اس کی ضرورت پیدا نہ ہوئی۔
مولوی محمد امین زبیری نے جنھوں نے اس سے پہلے بھی ندوہ کی بڑی

۱۸۰
 استاد کے ہاتھ پر، رانا کی اپیل حضورِ عظیم صاحبہ بھوپال کے کانوں تک پہنچانی
 جاتے ہو۔ ست بھوپال سے اپریل ۱۹۱۲ء میں دو برس کے لئے دوسور فیے
 ہوا منظور ہوئے۔ (جو غالباً اب تک جاری ہیں) اس کے علاوہ کتابوں
 کی خریداری کے لئے نواب زادہ حمید اللہ خاں (موجودہ فرمانروائے بھوپال)
 نے دو ہزار روپے منظور فرمائے۔

رسولِ اکرمؐ کے شیدائیوں نے مولانا کی بھولی بھردی اور انھیں اقتصاد
 الجہنوں سے بالکل آزاد کر دیا۔ چنانچہ سیرت کا کام شروع ہوا لیکن اس
 کی تکمیل میں بہت دیر لگی اور اس کے کئی وجوہات تھیں۔ ایک سبب تو
 یہ تھا کہ جس پیمانے پر مولانا یہ کام کرنا چاہتے تھے۔ اس کا اور مولانا کی
 کمزور صحت کا تقاضا تھا کہ وہ اس کام کے علاوہ باقی سب کاموں سے
 علیحدہ ہو جائیں۔ یہ مولانا سے ہوتا نہ تھا۔ جس وقت انھوں نے سیرت نبوی
 کے لئے اپیل شائع کی۔ ٹھیک اسی وقت وہ ”ندوہ کی بساط پر آخری
 بازی“ لڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اب انھوں نے
 سیاسیات کے میدان میں بھی قدم بڑھایا اور جو وقت سیرت پر صرف
 ہونا تھا۔ اس کا کافی حصہ پولیٹیکل انظموں اور مضامین کی نذر ہوا۔ اس
 کے علاوہ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے۔ انھیں کام کی مشکلات زیادہ
 نظر آنے لگیں۔ شروع میں جب وہ مغربی مصنفین کی کتابوں کے ترجمے
 سنتے تو وہ ان کے نتائج اور فیاسیات پر ایک احساسِ برتری سے مسکرا
 دیتے لیکن جب انھوں نے زیادہ تحقیق شروع کی۔ تو انھوں نے دیکھا کہ
 یورپ کی ان توپوں اور مشین گنوں کے لئے گولہ بارود تو مسلمان مصنفین
 نے خود مہیا کیا ہے!

نومبر ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے۔ ان کے ایک ایک حرکت کے لئے سیکڑوں اور اراق اُلٹے پڑتے ہیں۔ یہ کج نیت لکھتے تو جھوٹ ہیں۔ لیکن بے پرواہ نہیں لکھتے۔ یہاں خود ہمارے سیرت نگاروں نے بہت بے احتیاطیاں کیں۔

جن دنوں مولانا سیرت بنوی کی تالیف کی تیاری کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان سے بہت دور، بعض ایسے واقعات پیش آئے۔ جنہوں نے مولانا کو بے چین و بے قرار کر دیا اور اسلامی ہندوستان کی سیاسیات کا بھی ایک عرصے کے لئے رخ بدل دیا۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے خطر ابلیس پر، اور ۱۹۱۲ء میں بلقان کی عیسائی ریاستوں نے خود ترکی پر حملہ کر دیا۔ ترکی سے عام طور پر برطانوی حکومت کے تعلقات دوستانہ رہے ہیں۔ برطانیہ کو ایشیا میں روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ نہ تھا تھا اس لئے وہ مغربی ایشیا میں روس کے قدیمی حریف ترکی کی مدد کرتی۔ اسی مقصد کے لئے برطانیہ نے روس کے خلاف جنگ کریمیا میں حصہ لیا اور عام طور پر ترکوں کی حمایت کی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اُنیسویں صدی میں ترکی کو برطانیہ کی حمایت حاصل نہ ہوتی۔ وہ کب کا روس کے پنجہ آرز کا شکار ہو جاتا۔ لیکن لبرل پارٹی کے سرگروہ مسٹر کلیئر اسٹون ایک متعصب عیسائی تھے۔ وہ اور اُنکی پارٹی ترکی کے خلاف تھی۔ اس کے علاوہ جب بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں کو جرمنی کی طرف سے ایک خطرہ عظیم پیدا ہو گیا۔ تو وزیر خارجہ، سرائیڈورڈ گری نے اس خطرے کے سدباب کیلئے، نہ صرف فرانس، بلکہ روس سے بھی سمجھوتہ کر لیا اور مراکو، مصر، ایران، افغانستان کی نسبت ایسے معاہدے ہو گئے۔ جن کے بعد برطانیہ ترکی مدد سے کنارہ کش ہوا اور روس کا راستہ صاف ہو گیا۔ چنانچہ روس کو شہ پاکر بلقانی حکومتوں نے

ترکی پر حملے کئے اور ایک زمانے میں ترکی کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔
 ان واقعات نے اسلامی ہندوستان میں بڑا جوش پیدا کر دیا۔
 ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زمانے میں تو عثمانی ترکوں کی خلافت
 کبھی تسلیم نہیں ہوئی لیکن برطانوی حکومت کے دور ان میں ترکی سے
 اسلامی ہندوستان کے روابط بڑھ گئے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں
 غدر برپا ہوا۔ تو برطانوی حکومت کے ایمپائر سلطان روم نے ہندوستانی
 مسلمانوں کو انگریزوں کی حمایت کا پیغام بھیجا۔ اس کے بعد جب ۱۸۵۷ء میں
 جنگ روس و روم شروع ہوئی تو ہندوستان میں انگریزی افسروں نے
 ترکی کے لئے چندے جمع کرنے کی حمایت کی اور ہندوستان میں ایک
 عام جوش پیدا ہو گیا۔ سلطان عبدالحمید کی تحریک اتحاد اسلامی نے
 ترکی اور ہندوستان کے تعلقات کو اور مضبوط کر دیا۔ اس کے علاوہ
 ترکی اس زمانے کی سب سے بڑی اسلامی حکومت تھی اور اس کی نسبت
 اس کی سیاسی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس کی مشکلات نے اسلامی ہندوستان
 کو بڑا متاثر کیا۔ مولانا شبلی کو ترکوں سے شروع سے غیر معمولی محبت
 تھی۔ ان پر ترکی کے مصائب دیکھ کر اور عالم اسلام پر آنے والے
 مصائب کا خیال کر کے جو اثر ہوا۔ اس کا اظہار انھوں نے نومبر ۱۹۱۲ء
 میں ایک بڑی پرورد نظم میں کیا جو اردو زبان کے سیاسی ادب میں
 ایک تاریخی حقیقت رکھتی ہے۔

حکومت پروا لیا تو پھر نام و نشان سہتک
 قباۃ سلطنت کے جب فلک کر دئے پرنے
 مراکش جا چکا فارس گیا۔ ابے کھنایہ

چراغ کشتہ محفل سے اٹھ گدھواں کبتک
 فضاۃ آسمانی میں اُڑیں گی دھجیاں کبتک
 کہیتا ہی یہ قمر کی کامریض بخت ماں کبتک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے اسے روکے گا منظرِ نوکی آہوں کی دھواں کتنی
اور پھر آگے چل کر خیال ظاہر کیا کہ یہ لڑائیاں ملی یا سیاسی نہیں۔ مذہبی ہیں اور
صلیبی جنگ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بلا و مغرب سے خطاب ہے۔

کہاں تک ہم سے لوگ انتقام فتحِ ایوبی دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کتنی
سمجھ کر یہ کہ صندل سے نشانِ رنگاں ہم ہیں مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشان کتنی
پھر مسلمانوں سے کہا ہے کہ اگر ترکی مٹ گیا۔ تو اسلام مٹ جائے گا۔

نوال دولت عثمانی والی شروع دلت ہے عزیزِ فکرِ فرزندِ وعیال و خائماں کتنی
خدا را تم کچھ بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں نہ کچھ اب تو کچھ بھوکے یہ تیاریاں کتنی

مولانا محمد علی کی کوششوں سے ڈاکٹر انصاری احمد انصاری کی سرکردگی
میں ایک طبی مشن بلقان بھیجا گیا جس کے ممبر ترائی علی گڑھ کالج کے زیرِ تعلیم طلباء تھے۔
جب ڈاکٹر انصاری اس سفر کے لئے لکھنؤ سے گزرے۔ تو علامہ شبلی بھی پیٹ نام
پر الوداع کے لئے موجود تھے۔ گاڑی روانہ ہونے لگی۔ تو انھیں فوراً جوش
میں چاہا کہ ڈاکٹر انصاری کے پاؤں کا بوسہ لیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس
وقت بوٹ پہن رکھے تھے۔ علامہ ان ہی سے پیٹ گئے۔ لب سے بوٹوں کے
بوسے لئے۔ آنسوؤں سے ان کے گرد و غبار کو دھویا اور اس طرح اس مجسمہ
جوش و جذبات نے اپنے سوزِ دروں کو کھنڈا کیا۔

جب ڈاکٹر انصاری کا وفد واپس آیا۔ تو مولانا بھی میں تھے۔ اس وقت ہاں
غیر مقدم کا جو جلسہ ہوا تھا۔ اس میں مولانا نے ایک نظم پڑھی ہے
ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرت باری کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری

اس وقت نئی نسل میں ندوے کی شہرت نصف النہار پر تھی۔ اُردو شریعت پانچ عناصر خمسہ میں سے تین ختم ہو چکے تھے اور ایک خاموش تھا۔ صرف مولانا شبلی ہی ایسے تھے۔ جن کا قلم اس وقت حرکت میں تھا اور وہ اس قلم سے ندوے کی شہرت اور اہمیت بڑھا رہے تھے۔ ندوہ کے سالانہ جلسے بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے۔ قانون وقف علی الاولاد کے نفاذ میں اگرچہ اصل ٹھوس کام جسٹس امیر علی اور مسٹر محمد علی جناح نے کیا تھا۔ لیکن جو لوگ فقط الباب ندوہ کی تحریری یا اُردو کے وہ اخبارات پڑھتے، جن کا شیعہ علم یہی تحریریں تھیں۔ تو وہ سمجھتے کہ سارا فیض ندوے کا ہے۔ اسی طرح اگرچہ اشاعت اسلام کے معاملے میں ندوہ کو ذرہ بھر عملی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ لیکن بہر کیف سکیمیں تو بڑی بڑی تھیں۔ اب نئی نسل کی جو دیوبند سے ناواقف تھی اور علی گڑھ سے بدظن کی جا رہی تھی۔ ندوہ کی طرف آنکھیں اٹھتیں۔ اور مولانا عام جلسوں میں کہنے لگے ”کہ اگر اس وقت کوئی چیز مرجع ہو سکتی ہے۔ جو سنہ قرار دیا جاسکتا ہے تو وہ ندوہ ہے“ اور دیوبند وغیرہ کے ہوتے ہوئے الندوہ کے صفحات میں دعوے کرنے لگے، کہ ندوۃ العلماء ”تمام ہندوستان میں سب سے بڑی مقتدر مذہبی جماعت ہے“

اس زمانے میں ندوہ کا ڈنگا چاروں طرف بک رہا تھا۔ لیکن ندوہ کے حریف دیوبند کا رسالہ القاسم بار بار لکھتا تھا کہ ”آؤ دہل از دور خوش است والا معاملہ ہے اور فی الواقع اگر مولانا کے اپنے خطوط غور سے پڑھیں۔ تو خیال ہوتا ہے کہ یہ طعن حقیقت پر مبنی تھا۔ ندوہ کی مالی خوش استغایوں

کا جو حال تھا۔ اس کی نسبت مولانا شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں :-

غزوہ کی حالت نہایت اترے۔ شاہ جہاں پور کی جائیداد پر عدالت قبضہ دلا چکی لیکن ہمارے ہاں کوئی خبر نہیں ہوتا۔ جب دو چار خط مسمد مال کو میں اور مولوی عبدالحی صاحب لکھتے ہیں تو اک ذرا چونک کر پھر رہ جاتے ہیں۔ وہ اولاً تو کام کے عادی نہیں۔ اگر ہوں تو ان کو اپنا کام کیا کہہ ہے۔
للت پور میں ایک شخص نے دو سال ہوئے مکان وقف کیا تھا اب اس کا خط آیا کہ کوئی خبر نہیں لیتا۔ میں کیا کروں۔ یہی اور بہت سے مال معاملات کا حال ہے۔

علمی حالت اس سے بہتر نہ تھی۔ شبلی جون ساللہ کے ایک خط میں کہتے ہیں :-

بہر حال دارالعلوم سے اب ہاتھ دھونا چاہئے۔ جب تک کوئی ماہر فن نہیں آئے گا۔ علمی مذاق نہیں پیدا ہو سکتا۔

بورڈنگ ہاؤس کا حال اس سے بدتر تھا جب محکمہ تعلیم کے افسر معائنہ کے لئے آنا چاہتے تو شبلی انہیں اسی خیال سے سال دیتے کہ ندوہ اور بورڈنگ کی اس حالت میں انہیں بلا کر کیا دکھائیں اور جب بالآخر شبلی کے انتساب کے آخری ایام میں وہ آئے تو انھوں نے بورڈنگ ہاؤس کی نسبت لکھا۔ کہ یہ ایک خرگوش خانہ سے بہتر نہیں۔ اور ”چھٹھنوں کی سخت رپورٹ“ میں صاف کہہ دیا کہ اگر یہ حالت رہی تو سرکاری گرانٹ بند ہو جائے گی۔ لیکن ندوہ کی سب سے دکھتی رگ طلباء اور اساتذہ کی مذہبی حالت

تھی جو لوگ ندوہ کا اندازہ فقط الندوہ کے معنائیں اور سالانہ جلسوں کی دھواں دھار تقریروں سے کرتے۔ ان کے نزدیک تو ندوہ اسلامی ہندوستان کا سب سے بڑا مذہبی مرکز تھا لیکن ندوہ کی چار دیواری میں مذہب کا جو حال تھا۔ اس کا بیان علامہ شبلی کی اپنی زبان سے سنئے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ طلباء میں تقدس کا اثر نہیں ہے۔ آپ نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ایک دفعہ ندوہ کے لڑکے ڈیپوٹیشن کے طرہ پر بھیجنے پورے بھی گئے تھے۔ ان کی وضع سے آپ نے سمجھا کہ علی گڑھ کے لڑکے ہیں یہ میری موجودگی سے قبل کا زمانہ ہے۔ اس کی وجہ۔ میں نے بہت سوچا اس کے سوا کوئی نہیں کہ ابتداء سے آج تک کوئی پرنسپل مقدس اور بااثر نہیں ملا۔

ایک زمانہ میں مولوی فاروق صاحب مرحوم تھے۔ وہ خود بے پردہ تھے۔ مولوی..... صاحب خود پابند تھے لیکن اثر کچھ نہ تھا۔ خود ان کا لڑکا مولوی..... ڈاڑھی ترشواتا تھا اور وہ کچھ نہ کہتے تھے۔ اس کی نماز فجر نہ پڑھنے کی میں نے ان سے شکایت کی تو فرمایا کہ ”رات کو مطالعہ زیادہ دیکھتا ہے۔ اس لئے صبح کو سو جاتا ہے۔“ اراکین کا شدید باہمی نفاق اس پر مستزاد تھا۔ شبلی اپنے رفقاء پر سخت الزام لگاتے تھے اور وہ ان کے خلاف۔ شبلی کہتے ہیں:-

میں اس کو قطعاً ثابت کر سکتا ہوں کہ فلاں صاحب صبح کی نماز نہیں پڑھتے فلاں صاحب نے اپنی غفلت سے اس وقت تک ہزاروں روپیہ لوگوں کا ضائع کر دیا ہے۔ یعنی لوگوں نے کمرہ کی تعمیر کے لئے دیا تھا۔ وہ تعلیم پر مصرت کر دیا۔ علی ہذا۔ فلاں صاحب نے وقف کر کے اپنی جائیداد (العلم)

کو نہ دی اور اب تک مکین ندوہ ہیں۔ مکان دارالعلوم کارو پیوندہ اور
 کرچکا پاد جو اس کے دستارِ نزوایں نہیں کرتے اور اسی وجہ سے باوجود
 اس کے کہ وہ دفعہ جلسہ انتظامیہ میں منظور ہو چکا کہ مکان موجودہ فروخت
 کر ڈالا جائے۔ وہ فروخت نہیں کرتے۔

لیکن شبلی کی اپنی فرد جرم اس سے کہیں زیادہ تاریک تھی۔ مولانا ایک
 پُرمد خط میں مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھتے ہیں :-

”فرد جرم بہت بڑی ہے۔ خورد بُرو کا بھی الزام ہے۔ بہاول پور کے
 عطیہ کا اشتہار بھی جرائم میں شامل ہے۔ گورنمنٹ سے ایڈ کے متعلق خط و کتابت
 اکبر الجرائم قرا دی گئی ہے اور سب پر مستزاد الحاد اور زندہ جن عقائد
 کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا ان میں کرامات الادبیہ حق۔ حالانکہ میں تو
 کرامات الشیاطین حق کا بھی قائل ہوں۔ ہاں انھیں جرائم میں ابوالکلام
 کی حجت بھی ہے۔“

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شبلی کا اراکین سے اختلاف نصاب اور
 انگریزی کے مسئلے پر تھا۔ لیکن یہ اختلاف انھیں ندوہ آنے سے پہلے تھا اور
 مولانا جنیب الرحمن خاں شروانی کی مدد سے دور ہو چکا تھا۔ مولانا کی تمام
 تعلیمی اصطلاحیں کوئی پانچ برس سے ندوہ میں جاری تھیں اور ان کے
 اُس زمانے کے بڑے مخالف تو خود اصلاح نصاب میں ان کے حامی و
 ہم خیال تھے۔ مولانا شبلی نے ندوہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۷ء
 میں کہا :-

ہمارے مولانا خلیل الرحمن صاحب جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں ایک متعنت
 زاہد ہیں مگر جس وقت انگریزی داخل کرنے کا مسئلہ درپیش ہوا تو آپ بھی

تشریف رکھتے تھے۔ اگر میرا حافظہ غلط نہیں ہوا ہے (۵۵ برس کی عمر کا وہ جسے)
 تو مجھے یاد ہے کہ آپ نے کاملاً اس سے اتفاق کیا تھا اور کہا تھا کہ بے شک گمریزی
 زبان داخل ہونی چاہیے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوبارہ دوسرے جلسہ میں لکھنؤ میں
 بیات پیش ہونی کہ بجائے غیر ضروری اور غیر لازمی ہونے کے انگریزی لازمی
 اور کپیسری کر دینی چاہیے تو اس وقت بھی آپ نے شرکت اور تائید کی۔
 شبلی اور ان کے رفقاء کے کار کے درمیان جو اسباب اختلاف تھے۔ ان میں
 شاید ایک حد تک تو ذاتیات کو دخل تھا۔ ندوہ کے بڑے اراکین اس زمانے میں
 حسب ذیل تھے۔

نائب ناظم	مولوی خلیل الرحمن
دارالعلوم کے تعلیمی ادارے کے معتمد	مولانا شبلی نعمانی
دفتر مراسلات کے معتمد	مولانا عبدالحی
صیغہ مال کے معتمد	منشی احتشام علی رئیس کاکوری

قاعدے کی رو سے مولانا شبلی فقط درسیات کے صیغہ کے معتمد تھے لیکن جو
 جوں ندوہ ترقی کرنا گیا اور اس ترقی میں شبلی کی کوششوں کو زیادہ دخل
 ہوتا گیا۔ انھوں نے نظامت کے اکثر فرائض اور حقوق سنبھالنے شروع
 کئے اور اسے نائب ناظم (جو ناظم کی عدم موجودگی میں قائم مقام ناظم سمجھے جاتے
 تھے) اور دوسرے معتمدوں نے پسند نہ کیا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں :-
 اصل یہ ہے کہ منشی احتشام علی صاحب اور مولوی خلیل الرحمن صاحب
 بلکہ مولانا عبدالحی صاحب کو کسی قدر یقین ہے کہ میں ان لوگوں کے اختیار
 کا ضائع اندازی کرتا ہوں۔ اور ان کے کرنے کا کام خود کرتا ہوں۔
 پرصرت کر دیا۔ وہ نمایاں نہیں ہوتے۔

اس سے بھی بڑھ کر مذہبی عقائد اور عملی زندگی کا مسئلہ تھا۔ پہلے کی نسبت سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

مولانا کی تصنیفات میں علم الکلام اور الکلام ایسی دو کتابیں تھیں جو مسنف کی ہزار احتیاطوں کے باوجود علماء کے نزدیک اعتراض کے قابل تھیں۔ ان کے محض مباحث ٹھیکہ مذہبی خیالات کے سراسر خلاف تھے اس لئے علماء کی ایک جماعت جو مشکلمین کی آراء و تحقیقات سے بے خبر تھی۔ ایک مذہبی تعلیم گاہ کی صدارت کے لئے ان کو موزوں نہیں سمجھتی تھی۔

عملی زندگی کی نسبت بھی ان ہی کا بیان ہے :-

پھر اس اظہار میں بھی کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی توجہ و تقدس جو سداے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا اور اس لئے ان علماء کی نگاہوں میں جو ان چیزوں کے دیکھنے کے عادی تھے مولانا کا رنگ کھٹکتا تھا۔ اور اسی بنا پر وہ طلبہ کے لئے ان کی تعلیم و صحبت کو سخت منہ بکتے تھے۔

شبلی سے ثقہ علماء کو جو شکائتیں تھیں۔ ان کا بیان شبلی کے جانشین نے

نہایت دیانتداری اور بڑی وضاحت سے کر دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر سید سلیمان، از خود، ان باتوں کا اعتراف نہ کرتے۔ تب بھی جو کچھ انہوں نے کہا ہے، اس کی تائید میں اس طرح کی قطعی شہادتیں موجود ہیں کہ اس سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن شبلی کے پرجوش عقیدت مندوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے۔ جو شبلی کے خلاف ایک لفظ سُنتا گوارا نہیں کرتا۔ خواہ اس کے لئے واقعات ہی کا کیوں گلا گھونٹنا پڑے۔ اور شبلی سے فرقہ و عقیدت بنا بنے کے لئے کہتے ہی علماء و صلحا پر تبرہ لازم آئے!

پروفیسر آل احمد سرور (اعظم گڑھوی) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

پڑانے رنگ کے علما شبلی سے ناراض تھے۔ یہی ہمارے نزدیک شبلی کی روشن خیالی، بیدار فہمی اور دور بینی کی دلیل ہے۔

پروفیسر صاحب نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ انھیں غریب علما سے اس درجہ حسد کیوں ہے کہ ان کا کسی شخص سے ناراض ہونا ہی اس بات کا ایک قطعی دلیل ہو جاتا ہے کہ وہ شخص ضرور روشن خیال، بیدار مغز اور دور بین ہے لیکن سرور صاحب اور علما کے نقطہ نظر میں جو بنیادی فرق ہے۔ وہ آگے چل کر ان کے مضمون سے ٹپک پڑتا ہے۔ عطیہ سکیم کے نام شبلی کے خطوط کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

شبلی جذباتی آدمی تھے۔ پھر شاعر تھے۔ اچھی پڑھی لکھی خواتین سے متاثر ہوتے۔ وہ ان کی صحبت سے لطف اٹھاتے۔ اور زندگی میں اچھے کام کرنے کا دلولہ حاصل کرتے!

سرور صاحب اور علما کے نقطہ نظر میں جو فرق ہے۔ وہ ان ہی فقروں سے عیاں ہو جاتا ہے۔ سرور صاحب کے نزدیک اس بات میں کوئی قباحت نہیں کہ ایک شخص اللہ وہ کے صفحات پر تو پردہ کے حق میں زور دار مضمون لکھے اور جب علما کی محفل سے دور ہو تو بے پردہ خواتین کی صحبت سے لطف اٹھائے۔ بلکہ زندگی میں اچھے کاموں کا دلولہ حاصل کرنے کے لئے اس صحبت کا محتاج ہو!

ہم یہ نہیں کہتے کہ سرور صاحب کا نقطہ نظر ضرور غلط ہے۔ (اور ذاتی طور پر تو ہم ہمیشگی و اعلیٰ میں شبلی کو قابل الزام نہیں قابل رحم اور مستحق ہمدردی سمجھتے ہیں) لیکن یہ بھی تو الفاضل سے بعید ہے کہ ہم علما کو اس لئے تنگ نظر اور زنا ریک الذہن سمجھیں کہ وہ ایک ایسے شخص کو کم از کم مذہبی علما

کا سرگروہ ہونے کا اہل نہیں سمجھتے!

شبلی کے عقائد اور ان کی عملی زندگی پر اعتراض کرنے والوں میں مولوی غلیل الرحمن سہارنپوری سب سے آگے تھے۔ وہ مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کے صاحبزادے اور محدثین دہلی و دیوبند کی ان روایات کے شدید انتقادی تھے۔ جن کے تحت مذہبی علما میں سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کی اپنی زندگی کیسی ہے؟ نقوے اور پرہیزگاری میں ان کی کیا حالت ہے اور ظاہری اعمال اور باطنی پاکیزگی میں ان کا کیا درجہ ہے؟ ان باتوں میں مولانا شبلی عام دنیا داروں سے بھی پیچھے تھے۔ ان کا مذہبی جوش اور علم و فضل بے اندازہ تھا۔ لیکن قدیم علما کے نزدیک ان باتوں سے میرت کی کوتاہیوں کی تلافی نہیں ہوتی۔ چنانچہ مولوی غلیل الرحمن نے ان کی صحبت کو طلباء کے لئے سخت مضرت قرار دیا۔ اور ندوہ کے دیگر ارکان اور بہی خواہ (مثلاً شاہ سلیمان پھلواری شریف دالے) بھی 'شبلی کو قریب سے دیکھنے کے بعد' مولوی غلیل الرحمن کے ہموال ہو گئے۔

شبلی کے عقائد و اعمال میں کئی چیزیں ایسی تھیں۔ جو علمائے ندوہ کو بجا طور پر کھٹکتی تھیں۔ لیکن صرف شبلی تکی کمزوریاں ہی وجہ اختلاف نہ تھیں۔

۱۔ شبلی نے بعض خطوں میں لکھا ہے کہ مولوی غلیل الرحمن ناظم بننے کے لئے ان کی مخالفت کرتے تھے لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ جو شبلی کی آنکھیں بند ہوئیں مولوی غلیل الرحمن نے مجلس اصلاح ندوہ کے ایما پر (جو شبلی کے حامیوں کی ایک جماعت تھی) فوراً نظامت سے استعفاء دے دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انھیں نظامت عزیز نہ تھی۔ بلکہ ان کا مقصد فقط ایک فیر ثقہ ہستی سے ایک مذہبی دارالعلوم کو آزاد کرانا تھا۔

بلکہ شاید ان کی بعض خوبیاں بھی، ایک ناسازگار ماحول میں مخالفت کا سبب بن گئیں۔

قدیم طریقہ تعلیم کی حمایت اور قوم کی محبت شبلی کو علما کے دائرے میں لے گئی تھی لیکن عام بود و باش اور رہن سہن میں ان میں اور قدیم طرز کے علما میں بہت کم چیزیں مشترک تھیں۔ شبلی ایک رئیس کے بیٹے تھے۔ علی گڑھ میں جس ماحول میں رہے۔ وہ ”ملا یاں ملتی“ کے مقابلے میں ضرور امیرانہ سمجھا جائے گا۔ حیدر آباد میں وہ ایک بلند مرتبہ سرکاری افسر تھے۔ ان کے تین بھائی کامیاب وکیل اور بیرسٹر اور انگریزی طرز معاشرت کے دلدادہ تھے۔ ان سب باتوں نے انہیں ایک ایسے طرز رہائش کا عادی کر دیا تھا جو قدیم طرز کے علما کو بالکل انوکھا معلوم ہوتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اخیر عمر میں ان میں بڑی سادگی آگئی لیکن عین اس زمانے میں بھی جب وہ گراں زندگی کو قومی ترقی کا بڑا مانع قرار دیتے تھے اور مرید کو اس کا سبب سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے بھائی کو لکھتے ہیں ”اگر میرا قیام اعظم گڑھ میں ہوتا تو ایک وکٹوریہ فٹن کی بھی ضرورت ہو جی“ جس زمانے میں وہ قائم مقام نقل نویس تھے اور دس روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ اس وقت بھی وہ گھر سے کچری تک پیدل نہ جاتے تھے۔ اور دس روپے کی تنخواہ میں سے نو روپے کھوڑا گاڑی کے کمرائے میں اٹھ جاتے تھے۔ اخیر عمر میں جب انھوں نے برادران وطن کے کام کرنے کے طریقے غور سے دیکھے۔ تو ان کی طبیعت میں بڑی سادگی آگئی لیکن مزاج کی نفاست پسندی اب بھی باقی تھی اور ان میں اور قدیم طرز کے کوتاہ کیسے اور سادہ بستے تکلف علما میں رد و کد کے کئی مواقع نکلتے ہوں گے۔ سید سلیمان

کہتے ہیں۔ ”ان کو بعض مولویوں اور عربی خوانوں کی پست ہمتی اور عدم مہیا
وغیرہ سے سخت تنفر تھا۔ اس لئے علی الاعلان اس کی بھی بُرائی کرتے
تھے۔“ انھوں نے اس قسم کا ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے شبلی اور
عام علما و مدرّسین کے رنگ طبعانے کا اختلاف نظر آ جاتا ہے:-
ایک بار دارالعلوم میں ایک بڑے مدرّس کے سامنے زمین پر آم کے پھیلے
دیکھے تو فرمایا۔ ”آپ پھیلے کسی برتن میں کیوں نہیں رکھتے؟“ انھوں
نے کہا۔ ”بھئی آئے گا تو اٹھا لے جائے گا۔“ بولے کہ ”مولوی پہلے لکھتے
ہیں۔ پھر مٹاتے ہیں۔“

اس اختلاف معاشرت کے علاوہ جو ایک نفیس پسند رئیس زادے اور عام
مفلوک الحال، قدیم الحیال علما کے درمیان ناگزیر تھا۔ عام لوگوں کو شبلی کا
طریق کار بھی کھٹکتا ہو گا۔ شبلی ازل سے بلند ارادے لے کر آئے تھے۔
علی گڑھ نے ان کی منزل مقصود معین کر دی۔ اب ان کی ساری کوششیں
اپنے منہائے نظر کے لیے وقف تھیں لیکن ان کی منزل اتنی بلند تھی اور
فرصت اس قدر قلیل کہ انھیں اپنے وقت کا استعمال بڑی کفایت شعاری
سے کرنا پڑتا تھا۔

ایک ایک قطرے کا بچھ دینا پڑا حساب
خون جگر و دیعتِ مژگانِ یار تھا!

شبلی نے بڑی خوشی سے اپنے مقصدِ بلند کے لیے اپنے اوپر پابندیاں
عاید کر لیں اور اپنے صرف اوقات کی کڑی نگرانی شروع کی۔ وہ علی گڑھ
میں ہی تھے تو ان کے ملنے والوں کا دائرہ بہت محدود تھا اور سوائے
علی گفتگو کے وہ کسی چیز کو پسند نہ کرتے بلکہ ان کے اور سید محمود کے

اخیر عمر کے بگاڑ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں سود مزاج کے سبب سید محمود ”جدھر نکل جاتے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر گپ شپ میں مشغول رہتے اور وقت ضائع کرتے۔ مولانا ان کی اس عادت سے رنج ہو گئے۔ “علی گڑھ میں تو شبلی پھر ایک ملازم تھے۔ ندوہ آئے تو یہاں ان کی حیثیت ایک افسر کی تھی اور انھوں نے افسرانہ انداز سے اپنے لمحات فرصت کا بچاؤ شروع کیا۔ سید سلیمان کہتے ہیں کہ مولانا کے دروازے پر جعلی قلم سے یہ اعلان چسپاں رہتا تھا:-

جارِ بجے سے پہلے ملنے کی اجازت نہیں۔

شبلی نے تقیّع اوقات سے بچنے کے لئے جو طریقہ سوچا تھا۔ وہ ٹھوس مصلحتوں اور قومی ہی خواہی پر مبنی تھا اور فی الحقیقت قوم شاہراہ ترقی پر دوسری قوموں کا اسی وقت مقابلہ کر سکے گی۔ جب تمام افراد (اپنی اغراض کے لئے ہی نہیں بلکہ قومی بہبود کی خاطر) اپنے اوقات اور اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کریں گے لیکن ہندوستانی مسلمانوں میں جو سب سے قیمتی شے یعنی وقت ہی کو سب سے اڑاں چیز سمجھتے ہیں اور جہاں بیکار لوگوں کی بیکار باتوں میں مصروف اشخاص کے وقت کا بیدردانہ خون ایک شہر قومی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مصلحتیں کون سمجھے۔ شبلی علی گڑھ میں تھے تو وہ ”خشک اور مغرور“ گئے جاتے تھے۔ لیکن جب ندوہ کے قدیم انجیال علما ان کے دروازے پر اوقات ملاقات کا اعلان پڑھتے ہوں گے تو دل ہی دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ ایک عجیب قسم کا مولوی ہے جس سے ملاقات پر اسی طرح پابندیاں ہیں جس طرح کلکٹر ضلع سے ملنے کے لئے!

شبلی ندوہ میں تھے تو ان کی خامیاں اور خوبیاں دونوں ان کے رفقاءے کار کی نظر میں کھٹکتی تھیں۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
آپس کی اس کشمکش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ندوہ کے اکثر ارکان شبلی کو ندوہ سے نکالنے کے درپے ہو گئے۔ ان لوگوں نے چاہا کہ ایک کمیشن اس امر کی تحقیق کرے کہ ندوہ کے طلباء مذہبی امور کے کیوں پابند نہیں ہوتے اور چونکہ ان کے نزدیک شبلی کی صحبت کو اس میں بڑا دخل تھا۔ اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ ان کی بھی شہادت لی جائے۔ مولانا شبلی نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اس پر عمل نہ ہوا لیکن اس سے ان کی شہرت کو بہت ضعف پہنچا۔ وہ ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:-

کمیشن کی شہرت نے بہت بُرا اثر پیدا کیا۔ اقل تو تمام شہر میں مشہور ہے کہ فلاں شخص علیحدہ کر دیا گیا۔ دوسرے اس کی پختگی کے لئے شاہ سلیمان صاحب وغیرہ ہر جگہ یہ چرچا پھیلا رہے ہیں کہ فلاں شخص کی نسبت تمام ہندوستان میں بد عقیدگی اور الحاد کا شبہ عام ہو گیا ہے۔ اس لئے اب اس کے امتحان سے ندوہ کو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا۔

اس کے بعد ارکان نے فیصلہ کیا کہ ایک خاص جلسہ انتظامیہ منعقد کر کے مولانا کو برطرف کر دیا جائے۔ چنانچہ جلسے کی تاریخ مقرر ہوئی اور چونکہ مجلس انتظامیہ کی اکثریت مولانا شبلی کے خلاف تھی۔ اس لئے اُن کی برطرفی کی تجویز کا پاس ہو جانا یقینی تھا۔ لیکن مولانا کے مخالف سا دہلے مولوی لوگ تھے اور مولانا نے وکالت کا امتحان پاس کیا ہوا تھا انھوں نے

جلے کو ہی خلدان ضابطہ قرار دیا اور مجمع کو بے نیل مرام منتشر ہونا پڑا!

اس کے بعد ندوہ کے محسن کمرل عبد الحمید خاں نے ارکان کے درمیان مصالحت کی کوشش کی۔ ان کے سامنے استظامی جلسہ میں فریقین نے اپنی اپنی شکایتیں بیان کیں۔ ایک دوسرے کی تسلی کی گئی اور مقدس علما آپس میں گلے ملے۔ الندوہ میں شائع شدہ مضامین کے جن خیالات عقائد کے علما شاکی تھے۔ ان سے پرہیز کا اعلان کیا گیا۔ علمائے دیوبند سے علانیہ معذرت کی گئی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دلوں کا غبار نہیں گیا۔ مولانا شبلی اس مصالحت کے بعد تروانی کو آنے والے سالانہ جلسہ کی نسبت لکھتے ہیں: ”ندوہ کی بساط پر یہ آخری بازی ہے جس پر اس کی موت و حیات کا مدار ہے“

سالانہ جلسہ جو مارچ ۱۹۱۲ء میں منعقد ہوا۔ ایک بڑا بُرا رونق اور کامیاب جلسہ تھا۔ اس کو صدارت کے لئے مصر سے المناء کے ایڈیٹر سید رشید رضا تشریف لائے تھے۔ ان سے پہلے دورِ حاضر میں مصر یا دوسرے ممالک اسلامی کی کوئی ہرگز بدہمتی ہندوستان کی اسلامی تحریکوں میں شرکت کے لئے یہاں نہیں آئی تھی۔ اس لئے ان کی آمد پر بڑا جوش پیدا ہوا اور اطرافِ ملک کی مشہور ہستیاں جمع ہو گئیں۔ جلسے میں بعض بڑی مفید تجویزیں منظور ہوئیں اور مولانا ابوالکلام اور مولانا شبلی کی پُر اثر تقریروں نے حاضرین کو مسحور کر دیا۔

اس جلسے سے مولانا شبلی کا اثر و رسوخ بڑھ گیا اور انھوں نے ارکانِ ندوہ کو دکھایا کہ خواہ ندوہ کے اندر یا بیحد مذہبی حلقوں میں ان

کی قدر نہ ہو لیکن اطراف ملک میں ان کا اثر و رسوخ بے انتہا ہے۔ بظاہر تو مولانا کی یہ بازی کامیاب رہی لیکن ندوہ کی بساط پر ان کی قسمت میں بالآخر شکست لکھی ہوئی تھی مگر اس آخری فیصلے میں ابھی کچھ دیر تھی! ندوہ کی کشمکش اور محفصوں کے ساتھ ساتھ شبلی کی دوستیاں بلا بر قائم تھیں۔ ہم ان کے اس یُردِ درِ خط کا ذکر کر چکے ہیں جس میں انھوں نے اپنے رفقاء کے بارے میں تنگ آکر اسی زمانے میں، اپنے رفیقِ کار اور محبِ خاص، مولانا ابوالکلام آزاد سے فریاد کی تھی۔ عطیہ سے وہ خط و کتابت بھی جاری تھی۔ انھوں نے شبلی کو سالہ ۱۹۱۷ء کے شروع میں جو ”غضبِ آلود خط“ لکھا تھا۔ اس سے شبلی کے آئینہ دل کو بڑا صدمہ پہنچا اور انھیں نظر آگیا کہ امیدوں اور آرزوؤں کے جو محل وہ بنا رہے تھے۔ ان کی بنیاد ریت پر تھی لیکن خواہاںے رنگین کیشا ہو جانے کے بعد بھی رہی، دوستانہ مراسم قائم رہے بلکہ اس سال کے آخر میں شبلی کو ایک ایسا موقع میسر آیا جس کی بدولت وہ ان مراسم کو زیادہ مستحکم کر سکے۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں الہ آباد میں نمائش تھی اور عطیہ بیگم اس سلسلے میں وہاں تشریف فرما تھیں۔ شبلی بھی الہ آباد پہنچ گئے۔ اور عطیہ صاحبہ سے اکثر ملتے رہے۔ ان ملاقاتوں پر خطوطِ شبلی سے تو کچھ روشنی نہیں پڑتی لیکن ان کی نسبت عطیہ بیگم کی اپنی ڈائری میں ذیل کا اندراج ہے۔

نمائش الہ آباد۔ دسمبر ۱۹۱۷ء

ان ایام میں مولانا شبلی بھی تشریف رکھتے تھے اور اکثر ہماری ملاقات کے لئے آتے تھے اور بلاناغہ ایک خوانِ مہدہ اور اعلیٰ پوان کا بھیجتے تھے بجائے

بٹھھے میاں گو کہ پرانی وضع کے ہیں بگڑیالوں کی وسعت ایسی ہے کہ
کاش آج کل کے نئی روشنی دالوں میں ذرہ سی یہ بات ہوتی۔
نومبر ۱۹۱۲ء میں عطیہ یگم کی شادی ایک یہودی آرٹسٹ مسٹر سیوٹیل
سے ہو گئی شبلی اس کی نسبت مہدی حسن کو لکھتے ہیں :-

قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل و خوار بنا دئے گئے لیکن کیا ۵ دسمبر ۱۹۱۲ء
کے بھی جس دن کہ..... (عطیہ) ایک یہودی کو ہاتھ آئی مشہور کیا گیا ہے
کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے اس لئے تو نہیں کہ جس میں ہوا کافر تو کافر مسلمان ہو گیا

خیر سچہ را ز نار کرد دست و کند
شبلی نے نکاح میں تو شرکت نہیں کی لیکن اگلے سال جب وہ بمبئی گئے تو
دو ہاؤس سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ ایک صحبت کا ذکر عطیہ صاحبہ کی
ڈائری میں بھی ہے :-

۳ جون ۱۹۱۳ء۔ اس شام کو تمام شام مولانا شبلی نے ہمارے
ہاں گزارى۔ انھوں نے ایک رباعی میرے لئے کہی اور ایک رحمن
کے لئے !

عطیہ کی جو شادی پر کسی نے نکتہ چینی کی کہا میں نے جواب دیا یا احمق ہر یا ناداں ہے
بتان ہند کافر کر لیا کرتے ہیں مسلم کو عطیہ کی بدولت آج اکافر مسلمان ہے
شبلی از زبان سیوٹیل (رحمن) :-

ایک مدت سے مجھے شوق ہے تصویروں کا اس سو بڑھ کر کوئی تفریح کی تدبیر نہ تھی
تھی عطیہ کی بھی خواہش کہ مرقع میں برے اور سب کچھ تھا فقط حسن کی تصویر نہ تھی

۱۔ عطیہ یگم صاحبہ کی ڈائری میں نکاح کی تاریخ ۲۵ نومبر ۱۹۱۲ء درج ہے۔

علی گڑھ پر یلغار

ندوے کی بساط پر پہلی بڑی بازی شبلی نے ۱۹۱۲ء کے آغاز میں کھیلی۔ لیکن ان دنوں ان پر ایک عجیب نشہ پکڑ چھایا ہوا تھا اور ٹھیکہ سی زمانے میں وہ ایک وسیع بساط پر اس سے ایک بہت بڑی بازی کھیل رہے تھے!

یہ بازی اسلامی ہندوستان کی قیادت کی بازی تھی اور ان کا مقابل ان کا پڑا ناممدوح — علی گڑھ — تھا!

ہم شبلی کے خیالات کی اس تبدیلی کو نمایاں کر چکے ہیں جس کے تحت ان کو یقین آتا گیا کہ قومی مسائل کا حل قدیم یا جدید سے نہیں بلکہ جدید آئینہ قدیم ہو گا۔ اور اس خیال کو انھوں نے ندوہ میں عملی صورت دینی چاہی۔ فی نفسہ یہ اقدام نیک تھا۔ قومی بھی خواہی کے جتنے بھی ادارے ہوں بشرطیکہ وہ خاموشی سے اپنا کام کئے جائیں اور قومی خدمت کے بجائے ایک دوسرے سے وقف پکڑ نہ ہو جائیں قوم کے لئے مفید ہو سکتے ہیں لیکن شبلی کی دماغی ساخت اور ابتدائی نشوونما کا تقاضا تھا کہ وہ قومی خدمت کے میدان کو بھی ہم اور اغیار ہم اور حریف اس طرح کے نبرد آزما پسپائیوں سے ناہیں۔ ایک تو وہ نسل کے راجوت تھے۔ دوسرے مولانا محمد فاروقی کوئی کے شاگرد جن کے نزدیک علم ایک سیلاب

منظرہ باز کا آلہ کار تھا۔ اس کے علاوہ ان کا اپنا ”منظرانہ رنگ طبعیت“ بدست سے شبلی ان افراد میں سے تھے جو جب تک دوسرے کی پگڑی نہ اتارتیں۔ انھیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ان کا اپنا عامہ بھی سلامت ہے۔ وہ ازل سے جو ہر قابل کے کمرائے تھے لیکن جس طرح فرسا ماحول سے انھیں سابقہ پڑا۔ اس نے ان کا طبعی توازن نہ وبالا کر دیا۔ شبلی ایک میر گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدا میں نشاۃِ خاطر کے سب سامان میسر تھے لیکن سوتیلی ماں کی آمد حقیقی ماں کی آہ و زاری۔ قدیم تعلیم کی جس میں شبلی نے فروغ حاصل کیا تھا بے وقتی تلاشِ روزگار کی صعوبتیں علی گڑھ کالج میں دوسرے علوم کے اساتذہ کے بالمقابل السنہ شرقیہ کے اساتذہ کی بے قدری۔ ان سب باتوں نے شبلی کے عز نفس کو اس طرح مجروح کیا کہ ایک چوٹ کھائے ہوئے عھنوی طرح، ان کا دل ہوا کے جھونکوں سے بھی دکھ جاتا۔ جہاں ان سے اظہارِ مددوی ہوتا۔ وہاں انھیں ”استہزائے ثنات“ کے آثار نظر آتے اور جہاں حریفانہ مخالفت کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ وہاں بھی ان کی زخم خوردہ اتانیت مخالفانہ خود نمائی کے لئے تیار ہو جاتی۔ شبلی کے رنگ طبعیت کا تقاضا تھا کہ وہ جہاں نہیں بھی ہوں بالعموم کی قیادت کریں۔ وہ علی گڑھ میں تھے تو جلد ہی اس کے عزائم اور اس کی طریق کار کے مخالف ہو گئے۔ حمید آباد گئے۔ تو وہاں بھی ہر ایک سے بیزار اور ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ نہ وہ آئے تو یہاں بھی ہر وقت علما سے دست بگریباں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے والد سے شکایت و اختلاف کے باوجود، بڑی سعادت مندی اور بر خور واری کا برتاؤ کیا۔ لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ اگر ان کے اپنے گھر میں ان کے والد

کی خواہشات اور تجویزوں کے خلاف کوئی محاذ قائم تھا تو اس کے سرگروہ بنی سکتے! یوں تو شہلی کے عام رنگ طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ حزبِ لائیکٹان کے راہنما ہوں لیکن علی گڑھ کی مخالفت کے لئے، ایک خاص نفسیاتی سبب بھی تھا۔ اس کا بیان شہلی کے ایک ایسے واقعہ کا راہِ روفا دار دوست کی زبانی سنئے جو علمِ نفسیات کے جدید نظریوں سے تو واقف نہ تھا لیکن جس نے اپنی بالغ نظری اور قوتِ مشاہدہ کی بنا پر شہلی کی شخصیت کا تجزیہ بالکل ایک جدید نفسیاتی عالم کی طرح کیا ہے مولوی عبدالحلیم شرر شہلی کے قیام علی گڑھ اور وہاں کے اثرات کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:-

اب ان کے ساتھ ہی ان میں ایک دوسرا تغیر شروع ہوا۔ ان میں بادیِ خود تھا درجے کے اخلاق کے، خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت۔ علی گڑھ کالج کی مرجعیت اور ان کی ذاتی قابلیت نے انھیں ابتداءً اس حیثیت سے پہلک میں متعارف کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمراہ حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی ہو گئی مگر خود مولانا شہلی کی خودداری اس حیثیت کو (اپنے سے بہت کم، بلکہ ذلت اور سبکی تصور کرتی تھی) اپنی تصنیف اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے۔ جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابلِ برداشت دیکھ کے، علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے، مدۃ العیام میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعہ

لے خطوط وحدانی والی عبارت ہم نے رسالہ کتاب سے نقل کی ہے۔ شرر کا جو مضمون ہمیں ملا ہے۔ اس سے یہ غائب ہے اور بیان بے ربط ہے۔

سے میں علما کا متراج اور شیخ الکمل بن کے اس درجہ پر پہنچ جاؤں گا جو
سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔

میں نے بارہا ان کو اس خیال سے روکا.... مگر انھوں نے نہ مانا۔

سر سید اور علی گڑھ کی نسبت شبلی نے اخیر میں جو رویہ اختیار کیا۔ اس
میں ان کے خاص رنگ طبیعت اور نفسیاتی ساخت کو بڑا دخل تھا۔ لیکن
بعض خارجی اسباب بھی ایسے تھے جنہوں نے ان میں علی گڑھ کی مخالفت
کو بھڑکایا اور ان میں سے ایک بڑا سبب سید جمال الدین افغانی اور
شیخ محمد عبدہ کی تحریک کا اثر تھا۔

مولانا شبلی علی گڑھ میں ہی اس تحریک سے بخوبی واقف تھے۔ وہ جب
مصر گئے۔ تو شیخ محمد عبدہ سے ملے اور ”دیر تک لطف کی صحبت رہی“ سید
جمال الدین نے قیام حیدر آباد کے دوران میں ایک فارسی رسالہ ردِ پنجریہ
میں لکھا تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے اس کا عربی ترجمہ ردِ دہرین کے نام سے
کیا تھا اور اس کے شروع میں سید نے حالاتِ زندگی لکھے تھے۔ مولانا

لے مولانا شبلی ندوہ کی ایک بالکل ابتدائی تقریر میں کہتے ہیں۔ ”قوم کی زندگی کا بہت
بڑا حصہ اب بھی علما ہی کا حق ملکیت ہے اور وہی اس حصہ کی غمراتواری کے حامل ہیں۔
ہیں یا ہو سکتے ہیں“ اس کے بعد علما کی تنظیم اور ندوہ کو زیادہ موثر بنانے کے
طریقے بتا کر اس وقت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ جب ندوہ پوری طرح عروج پر ہوگا
فرماتے ہیں۔ ”ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہوگی کہ تمام جماعتِ مسلمان
اس کی ہدایتوں کی پابند ہو۔ اس کے فتوؤں کے آگے سر جھکائے۔ اس کے
فیصلوں سے سرتابی نہ کر سکے“

شبلی نے اپنے سفرنامہ میں ان حالات کا ایک اقتباس نقل کیا ہے اور شیخ کی مہارت فن اور زور تحریر کی تعریف کر کے، ارباب فن کو مشورہ دیا ہے کہ وہ شیخ کے طرز کی تقلید کریں۔

سید جمال الدین افغانی اس زمانے کے ایک مشہور اور مقتدر اسلامی راہنما تھے بلکہ جو لوگ عملی کاموں سے نہیں بلکہ ارادوں اور منصوبوں سے ایک راہنما کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے ہیں ان کے نزدیک وہ اُنیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان تھے۔ ان کی اصل کی نسبت خبیہ ہے کہ وہ ایرانی النسل تھے۔ یا افغانی الاصل لیکن وہ جوانی میں ہندوستان آگئے پھر مصر، فرانس، ترکی، ایران جا بجا پھرتے رہے۔ اور اپنے زورِ قلم اور زورِ زبان سے ان ملکوں کی سیاسیات پر اثر انداز ہوئے۔ وہ تحریک اتحاد اسلامی کے بڑے حامی تھے لیکن عبرت کا مقام ہے کہ انھیں کسی اسلامی حکومت میں جگہ نہ مل سکی۔ یا آرام سے رہنا نصیب نہیں ہوا اور جس شخص نے تحریک اتحاد اسلامی کو پہلی مرتبہ عملی صورت دینی چاہی یعنی سلطان محمد وہ ان کا جانی دشمن ہو گیا۔ اور اس نے ان کو زہر دلوادیا!

سید جمال الدین بلا کے ذہین و طباع اور ایک بڑی وجہ اور مقناطیسی شخصیت کے مالک تھے لیکن انھیں عام طور پر کسی ملک میں بہ یک وقت دو چار مہینے یا ایک دو سال سے زیادہ قیام نہیں آیا اور اس وجہ سے ان کا اور محدود معلومات کی بنا پر انھیں افراد و اقوام کی نسبت فیصلہ کرنا پڑتا

لے سید جمال الدین نے سید احمد خاں کی نسبت اپنی وسیع معلومات کے موافق جابجا لکھیں ہیں۔ ایک خوب منظم ملاحظہ ہو۔ ”انگریزوں نے احمد خاں کے ساتھ احسان کیا اور اس کے لڑکے محمد کو ہندوستان کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں پوسٹل کسٹرن بنا دیا۔“

تھا چنانچہ بعض اوقات شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے۔ ان میں اور سرسید میں سوائے شدید اسلامی محبت کے کوئی چیز مشترک نہ تھی سید جمال الدین تحریک اتحاد اسلامی کے سرگروہ تھے اور سرسید کا خیال تھا کہ جب تک عالم اسلام کے تمام اجزاء اپنی اپنی جگہ خوشحال اور طاقتور نہ ہوں۔ ان کا اتحاد بھی موثر نہیں ہو سکتا اور گرم از گرم موجودہ سیاسی حالات میں تو اسے ایک عملی صورت دینا محالات سے ہے۔ اسی طرح طبیعتوں کا اختلاف تھا سید جمال الدین کا دل و دماغ آتشیں اجزاء سے مرکب تھا۔ سرسید کے دل کی گہرائیوں میں بھی قومی حرارت بے حد تھی لیکن غدر کی زالہ باری میں جس اسلامی ہندوستان کا خرم اقتدار تباہ کیا تھا، اگر سرسید کے سیاہ بال عجم غم سے سفید ہو گئے تھے تو وہاں ان کا دماغ بھی بروت کی سل بن گیا تھا۔ اب وہ واقعات اور معاملات کو شباب کی کیف اور ولولہ انگیز آنکھوں سے نہ دیکھتے بلکہ ان کا مطالعہ خشک اور ”نشتہ شکن“ منطق کی روشنی میں کرتے۔ سید جمال الدین شاید سرسید سے زیادہ ذہین اور تیز نگاہ تھے۔ لیکن سرسید ان سے کہیں زیادہ ٹھوس اور ٹھوس عملی کاموں کے لئے ان سے زیادہ فائدہ پہنچاتے تھے۔ اسی طرح صورتِ حالات کا فرق تھا۔ سید جمال الدین جب تمام عالم اسلام پر نظر ڈالتے تو انھیں برطانیہ کی بڑھتی ہوئی استعماری طاقت سے سب سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا۔ لیکن جب سرسید ہندوستان کے خاص حالات کو دیکھتے تو انھیں خیال آتا کہ ہندوستان کے تو حالات ہی ایسے ہیں کہ یہاں برطانوی حکومت اور مسلمانوں میں اتحاد آسان بلکہ ناگزیر ہے!

سید جمال الدین اور سرسید میں خلوص، قابلیت، بے انتہا قومی ہمدردی کے باوجود اس طرح کے بنیادی اختلافات تھے کہ سید جمال الدین کے لئے

ہندوستانی مسلمانوں کی خاص مشکلات کا اندازہ لگانا یا سرسید کے ٹھوس طریق کار کی قدر کرنا سیرے سے ناممکن تھا لیکن اس بعد المشرقین کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی، اس آتشیں قلم افغانی نے سرسیدؒ اور ان کے خاص احباب اور شرکائے کار کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھئے اور اس بڑھے ہندوستانی کی قسمت پر نہیں، بلکہ اسلامی اخلاق و تہذیب کے زوال پر سر پیٹ لیجئے :-

کتا ایک بڑی حامل کرنے کیلئے خوشامد کرنا ہے۔ اپنی دم ہلاتا ہے اپنے صحن کے پاؤں پر خواہ وہ اپنا ہو یا بیگانہ، سر رکھ دیتا ہے۔ اور اظہارِ خلوص کے لئے ؟؟؟۔ انسان گتے سے بھی گیا گزرا ہے۔ لا حول ولا اے چاہئے کہ خوشامد اور عاجزی میں گتے سے بہت آگے نکل جائے۔ اگر اس کے دم نہیں تو کم از کم ڈاڑھی تو ہے۔ ناستودہ مرگ خاں نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا! اور اس بات کیلئے تیار رہتا تھا کہ آواز نکالے ڈاڑھی کو حرکت دے۔ اور جو روٹی کے ٹکڑے اسے ملے ہیں۔ انھیں اس طرح حلال کرے۔ خدا کرے کہ یہ اظہارِ شکر مزید عنایات کا ذریعہ ہو!

سگ از برائے اسفصال استخوانے تملق مے کند۔ و دے حرکت مے دہد۔ و سر پر پائے معطلی نہادہ، چہ خودے باشد چہ بیگانہ، بجمت اظہارِ خلوص نیست روز ہادرے دہد۔ انسان از سگ ہم کمتر است۔ لا حول ولا۔ انسان را چنان مے زبید کہ در تلق و خضوع ہزار مرحلہ برسگ بایشی گیرد۔ و اگر دم ندارد۔ ریش ہم کم از ان نیست۔ ناستودہ مرگ خاں ہمیں نکتہ را فہمیدہ انراں بود۔ کہ آواز برآورد۔ ریشہ حرکت دارد۔ نان ہائے خود را حلال کہد۔ خدا کند۔ کہ این شکر سبب مزید نعمت گردد۔

سر سید کی نسبت قوم کے ایک پتے (مگر پٹھان!) عاشق نے جس غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے۔ اس کے متعلق شاید بعض لوگوں کو خیال ہو۔ کہ یہ ”غلبہ“ ”حال“ ”غذہ“ ایسی اختلافات کی بنا پر نکلا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذہبی معاملات میں سید جمال الدین کا حال بھی سر سید سے مختلف نہ تھا اور ان پر بھی ضعیف العقائد اور ترک مصلوٰۃ کی بنا پر الحاد و کفر کے فتوے لگے تھے۔ اللہ وہ کی ایک اشاعت میں مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

المنار جو مصر کا مشہور و مستند مذہبی رسالہ ہے۔ اور جس کا ایڈیٹر سید رشید رضا علمائے مصر میں سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ اس نے ہمدانی نسبت جو نو طوائف کیا ہے۔ اس کا ترجمہ اخبار وکیل میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک عبارت کے سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ عبارت (کا ترجمہ) یہ ہے۔ ”یعنی شبلی پر لوگوں نے اعتراض اور نواز ترک کرنے کا الزام لگایا ہے۔ جیسا کہ اس کے پہلے اس ملک دو مصلحین پر یہ نہت لگائی گئی تھی“ وکیل نے اس کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ ان دو مصلحین سر سید اور ذوالحسن الملک مراد ہیں لیکن درحقیقت المنار کا اشارہ شیخ جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عابد کی طرف ہے!

سید جمال الدین کی آتشیں طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ جم کر کوئی ٹھوس انداز کر سکیں لیکن اسی آتش مزاجی کا نتیجہ تھا کہ وہ جہاں گئے۔ انھوں نے فضا کا جمود برہم کر دیا اور گرد و لوازم میں ایک نیا جوش، ایک نئی چہل پہل، ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ انھوں نے بعض بڑی عظیم الشان شخصیتوں کو متاثر کیا۔ جن میں شیخ محمد عابد کا نام خاص امتیاز رکھتا ہے۔

شیخ محمد عابد ایک زمانے میں مصر کے مفتی اعظم تھے اور انھوں نے مصر میں محدود خیالات کو روکنے کی بڑی کوشش کی۔ شیخ اور شیخ کے ممتاز اگر علماء

رشید رضا نے کلام مجید کی جو تفسیر لکھی ہے۔ بالکل سرسید کی تفسیر کے اصولوں پر ہے لیکن مصر میں جو حالت جدید کی تھی (اور ہے!) اسے دیکھ کر وہ جدید کے بھی بہت مخالف تھے۔ جب شبلی سے شیخ محمد عبدہ ملے تو انھوں نے انہر کی ابتری تعلیم پر افسوس کیا۔ "لیکن اس کے ساتھ نئی تعلیم کے بھی سخت شاک کی تھے اور کہتے تھے کہ "هنا اصل یبید" (وہ اس سے بھی بدتر ہے!) "شیخ نے "لائحۃ الاصلاح والتعلیم دینی" کی ایک تعلیمی سکیم بھی بنائی تھی جس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ اگرچہ شیخ دس سال تک انہر کے شیخ الجامعہ رہنے کے بعد بھی اسے انہر میں جاری نہ کر سکے لیکن شبلی نے اسے ندوۃ العلماء میں عملی جامہ پہنا دیا۔

سید جمال الدین کے اثر نے شبلی کو سرسید سے زیادہ بدظن کر دیا۔ اور شیخ محمد عبدہ نے انھیں ایک ایسا راستہ دکھا دیا۔ جسے وہ احیائے دین اور اصلاح تعلیم کا واحد طریقہ کار سمجھنے لگے۔ لیکن علی گڑھ کی مخالفت بخیرتہ کرنے میں بعض مقامی اثرات بھی شامل تھے اور شاید اس میں شبلی کے قیام بمبئی کو بڑا دخل تھا۔ بمبئی شروع سے کانگریسی خیالات کا بڑا مرکز رہا ہے۔ سرسید کی مخالفت کے باوجود جو مسلمان کانگریس میں شریک ہوئے۔ ان میں سے بیشتر بمبئی کے تھے۔ اور اتفاق ایسا ہوا کہ جب ندوہ میں آجائے کے بعد ہر سال موسم گرما میں شبلی بمبئی آتے۔ تو ان کی زیادہ آمد و رفت ان مسلمان خاندانوں میں ہوتی جو سرسید کے مخالف تھے۔ شبلی کے لئے اُن فی میٹی کا سب سے درخندہ ستارہ بلکہ ماہتاب عظیمیگم تھیں۔

جو کانگریس کے مسلمان پریذیڈنٹ اور سرسید کے سیاسی مخالف (جسٹس) بدر الدین طیب جی کی ایک قریبی عزیز تھیں اور سیاسی معاملات میں اپنی خاندانی روایات کی شدت سے قائل تھیں۔ انھوں نے علی گڑھ کے بعض اداروں کی نسبت شبلی کے نام ایک خط میں جو خیالات ظاہر کئے تھے۔ انھیں ان کے اپنے الفاظ میں منسے :-

کانفرنس (یعنی علی گڑھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) اور مسلم لیگ سخت ہکو
ہیں بزدل لوگوں کے۔۔۔ انگریز جس قدر مسلمانوں کو بناتے ہیں۔ اسی
قدر یہ بنتے جلتے ہیں۔

شبلی "کم وقعت فرقہ مجددہ ہند" کی نسبت عطیہ بیگم کے یہ الفاظ نقل
کر کے مہدی حسن کو لکھتے ہیں :-

میں تو بہ خدا ان نفروں پر ایمان رکھتا ہوں۔ گو "کافر" کے منہ سے نکلتے ہیں۔
اپنی ہنجیال عطیہ بیگم کو اس خط کے جواب میں لکھتے ہیں :-
بدلتوں کے بعد آج ایک ہم خیال ملا۔ کانفرنس (ایجوکیشنل کانفرنس) وغیرہ کی
نسبت سب سے بڑا پڑتا ہے کہ یہ کیا ڈھکوسلے میں۔ لیکن دینا یا گل ہونا
ہے۔ کس کو سمجھائے۔ مسلمان پالیٹیکس میں آئے۔ تو جس طرح نادان کچھ بات
بات پر بھلتا ہے۔ اور طفلانہ حرکتیں کرتا ہے۔

آج کل یہاں مسلم لیگ کا ابلار تھا۔ تمام ہندوستان کے لال بھکر جمع تھے
ان کی تجویزوں اور خیالات پر مہنسی آتی ہے۔
اس کے کچھ عرصے بعد انھیں ایک اور ہنجیال ملا جس سے علی گڑھ کا لکھنؤ کی نسبت

باتیں ہوتی رہیں۔ شبلی بڑے چاؤ سے اپنی آشنائے رازہ عطیہ کو راضی دیتے ہیں۔
اب کے دلی میں نعام الحق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور دیر تک صحبت رہی۔
شکر ہے کہ وہ بالکل میرے مخیل ہیں۔ اور ان کا اعتقاد ہے کہ مسلمان جس چیز
کو قبلہ حاجات سمجھ رہے ہیں۔ وہ غلامی اور خوشامد کا کارخانہ ہے۔

مصر اور سیدی کے اثرات کے علاوہ ایک اور چیز جس نے شبلی کے دل میں
سرسید اور علی گڑھ کی مخالفت کو مستحکم کر دیا۔ شاید ابوالکلام آزاد کا اثر صحبت
تھا جو ۱۹۰۷ء۔ ۱۹۰۸ء میں کوئی سال ڈیڑھ سال تک ندوہ میں مقیم رہے۔
جس وقت شبلی علی گڑھ کالج سے علیحدہ ہوئے۔ اس وقت وہ جدید کے
مقابلے میں قدیم کے ترجمان تھے۔ اور چاہتے تھے کہ جدید اور قدیم کا ایک
معجون مرکب بنا کر دکھیں۔ کہ قوم کے لئے یہ کس حد تک مفید ہوتا ہے۔ لیکن
علی گڑھ یا سرسید کے لئے ان کے دل میں ابھی کوئی خاص جذبہ عناد و مخالفت
نہ تھا۔ وہ کالج سے علیحدگی کے بعد بھی علی گڑھ آتے جاتے رہے محسن الملک
سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ اور ۱۹۰۸ء تک ان کے خطوط سے
چلتا ہے کہ وہ بڑی خوشی سے علی گڑھ کے واپس دوبارہ گرفتار
کے لئے تیار تھے۔ اس دوران میں فقط حیات جاوید کے متعلق ہی
ایک ایسا اظہار خیال ملتا ہے۔ جس سے سرسید کی مخالفت کا استنباط کیا
جاسکتا ہے لیکن یہ استنباط بھی قطعی نہیں۔ اسے سوانح نگاری کے متعلق شبلی
کے اس نقطہ نظر کا نتیجہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے جس کا انھوں نے کئی جگہ
اظہار کیا ہے۔

شبلی کی خانگی تحریروں میں دسمبر ۱۹۰۷ء سے پہلے اور عام تحریروں اور
نظموں میں ۱۹۰۷ء سے پہلے ہمیں کوئی اندراج ایسا نہیں ملا جس سے قطعی

طور پر اندازہ لگایا جاسکے کہ شبلی اب علی گڑھ کے مقابلے میں ایک حریفانہ انداز سے صفت آراہونے والے ہیں۔ اس کے بعد شکائتوں اور الزاموں کا سراغ ملنا شروع ہو جاتا ہے اور اس دوران میں جن اثرات سے انہیں سابقہ پڑا۔ ان میں جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔ ایک ایسے نوجوان کا ندوے میں قیام تھا جو شروع سے سرسید احمد کی مخالفت میں پختہ کار تھا جس نے ۱۹۰۷ء میں ہی حیات جاوید اور سرسید کے برخلاف لسان الصدق میں مضامین لکھے تھے اور جسے سرسید کی مخالفت میں اس قدر غلو تھا کہ حالی جیسے بُردبار اور فرشتہ خصلت انسان نے ایک زمانے میں اس کے اخبار الہلال کو ہدینا لینے سے انکار کر دیا!

شبلی اور ابوالکلام آزاد کی عمروں میں جو فرق تھا۔ اس کا لحاظ رکھ کر شبلی کا ایک سترہ سالہ نوجوان کے خیالات سے متاثر ہو جانا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن آزاد نہایت ابتدائی عمر میں پرلے درجے کے پختہ کار تھے اور شبلی کی دماغی ساخت اس طرح کی تھی کہ وہ قدیم کے ترجمان ہونے وجود ہر سمت سے نئے اثرات قبول کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ جس آزاد کے اثر صحبت نے شبلی کو کھینچا۔ اس سمت کے لئے ہر طرح کے طبعی، ذہنی، علمی اور سیاسی رجحانات تو پہلے سے موجود تھے۔ فقط اس صحبت میں ان رجحانات نے ایک واضح صورت اختیار کر لی۔

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی ”عالم السرائر“ اس راز سے پردہ نہ اٹھائے۔ قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ آزاد کے قیام ندوہ کے دوران میں شبلی کا آزاد پر زیادہ اثر پڑا۔ یا شبلی اس ذہین اور تیز و طرار نوجوان سے زیادہ متاثر ہوئے۔ لیکن کم از کم یہ امر قوت پرین قیاس ہے کہ اس دوران

میں دونوں کے درمیان جو گفتگوئیں ہوئیں۔ ان سے دونوں کا طرزِ عمل زیادہ واضح اور منضبط ہو گیا۔ حتیٰ کہ جب ارد باب علی گڑھ کے خلاف اعلانِ ملک کا وقت آیا۔ تو شبلی اور آزاد دونوں پہلو بہ پہلو صفِ آبد تھے۔

س کے درمیان، اس زمانے میں اس درجہ ”اتحادِ خیال اور دلِ یکساں“ کہ اس جنگ میں علی گڑھ کے خلاف جو اسلحے استعمال کئے۔ ان کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آزاد کے دماغ کی اختراع

۱۔ یا شبلی کا عطیہ !!

ان نئے اثرات کے ساتھ ساتھ اب غیر سے شبلی کا ندوہ بھی جوان ہو رہا تھا اور آہستہ آہستہ اس قابل ہوتا جاتا تھا کہ علی گڑھ سے ٹکرائے۔ اب شبلی کے خطوط میں علی گڑھ کی شکایتیں اور علی گڑھ کے مقابلے میں ندوہ کی فضیلت کا اظہار شروع ہو گیا۔ ایک خط میں مہدی حسن کو مولوی عبد السلام ندوی کی نسبت لکھتے ہیں :-

عبد السلام نہایت ہوشیار ہے۔ وہ پورا مصنف ہو سکتا ہے۔ اور ہوگا۔ انگریزی نہیں جانتا لیکن پڑھ رہا ہے۔ ندوہ اس قسم کے جواہر کا چمکنے والا ہے لیکن علی گڑھ کی بے مہری ندوہ کو ابھرنے نہیں دیتی۔

مہدی حسن، علی گڑھ سے شبلی کے روز افزوں اختلافات سے خوش نہ تھے۔ نہ انھیں یہ معلوم تھا کہ علی گڑھ نے ندوہ سے کون سی بے مہری برقی ہے اور نہ انھیں یہ پتہ چلتا تھا کہ ندویت کیا چیز ہے اور اس کا کیا

نائدہ ہو گا۔ شبلی انھیں ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں :-
 ندوۃ آپ کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن انصاف کیجئے جن لوگوں کی آپ قدر

کہتے ہیں۔ وہ کس کان کے جوہر ہیں۔ کانج کے یا ندوہ کے؟
 ندوہ اب سن بلوغت کو پہنچ چکا تھا اور شبلی علی گڑھ کو خوشامد اور غلامی
 کو کارخانہ سمجھتے تھے لیکن انھوں نے اپنا اظہار خیال زبانی گفتگو اور نجی
 خطوط تک محدود رکھا۔ علی گڑھ سے ان کے ظاہری تعلقات برقرار رہے۔
 ندوہ کے اسٹیج پر سب سے پہلے کوس اناؤ لاغیوی شبلی کے نوجوان اور
 کیمپ انانیت سے سرشار دوست، مولانا ابوالکلام آزاد نے بجایا جنھوں
 نے اپریل ۱۹۰۱ء کے ”ندوۃ العلماء میں“ ”ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی اور قوم
 کی شاہراہ مقصود“ کے عنوان سے ایک ولولہ انگیز مضمون لکھا جس کا
 ماحصل یہ تھا کہ نئے گروہ اور انگریزی تعلیم کے ترجمانوں سے کچھ نہیں ہوا۔
 ”صرف ندوہ ہی قومی ترقی کے لائیوئل عقدے کو حل کر سکتا ہے“ اور دارالعلوم
 ندوہ کی سہ سالہ رپورٹ پر قبضہ کرتے ہوئے لکھا: (۱)

ہمارے تنزل اور انحطاط کے تمام اسباب اس نقطے پر جا کر ختم ہوتے ہیں کہ
 قوم کے پرشان اور متفرق ٹکڑے کا کوئی راعی نہیں لیکن دارالعلوم (ندوہ)
 اپنی تعلیم و تربیت سے جو جماعت طیارہ گرد ہے۔ وہ اس بھٹکے ہوئے
 بے راہ ٹکڑے کو جمع کرے گا..... اس سے توقعات قائم کرنے میں جس قدر
 اسراف کیا جائے۔ کم ہے۔

اس مضمون پر علی گڑھ کے حامی چونکے اور اس کے جواب میں اٹاؤہ
 کے البشیر نے ”علی گڑھ کانج پر ایک اور حملہ“ کے عنوان سے ایک آڈیو ٹیکل
 لکھا جس میں ارکان کانج کو مشورہ دیا گیا تھا کہ انھیں ندوہ سے قطعاً علیحدگی

اختیار کرنی چاہئے۔ لیکن ندوہ کی باگ ڈور ایک بڑے ہوشیار اور مجاہد و منتظم کے ہاتھ میں تھی۔ شبلی نے فوراً اس آرٹیکل کا دوستانہ جواب لکھوا کر وکیل وغیرہ میں چھپوا دیا۔ اس کے بعد جب البتیر میں اس مسئلے پر مزید مضامین چھپے تو مولانا نے خود اندوہ میں جواب لکھا اور مضمون نگار کی توجہ ان دوستانہ تعلقات کی طرف دلائی جو سرسید۔ نواب محسن الملک وغیرہ کے ندوۃ العلماء سے تھے۔ مولانا شبلی غیر معمولی احتیاط کے انسان تھے۔ وہ ابھی ”ابھی علی گڑھ کی خدائی“ سے ڈرتے تھے اور کھل کر کچھ نہ کہتے تھے۔ لیکن ۱۹۱۱ء کے آخر اور ۱۹۱۲ء کے آغاز میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے اس احتیاط کی ضرورت ختم کر دی۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار ہوا اور اس موقع پر تقسیم بنگال جس کے متعلق حکومت بار بار اعلان کر چکی تھی کہ اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ مسوخ کر دی گئی۔ مسلمان بالعموم تقسیم بنگال پر خوش تھے۔ انہیں اس کی تسخیر کا افسوس ہوا اور دوسرے گورنمنٹ کے فیصلے کا عام طور پر یہ نتیجہ سمجھا گیا کہ حکومت بنگالیوں کے ایجنڈیشن سے دب گئی ہے علی گڑھ کالج کے سکریٹری نواب وقار الملک دربار سے واپس آئے تو انھوں نے اگر پہلی فرصت میں ”ہندوستان میں مسلمانوں کی آئندہ حالت“ کے عنوان سے ۲۰ دسمبر کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک پُر زور مضمون لکھا۔

جس میں نہایت متین اور مہذب طریقے سے گورنمنٹ کے فیصلے پر سخت نکتہ چینی کی اور یہ بتا کر کہ ”وفاداری عرض ہے۔ جوہر نہیں۔ اس کی بنیاد بھی کسی اور چیز پر قائم ہوتی ہے“ آخر میں کہا:۔

یہ آفتاب نصف النہار کی طرت اب روشن ہے کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد

جو اس وقت مشاہدہ میں آئے۔ یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ لا حاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے بھروسوں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ وہ ہماری قوت بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے قابلِ احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے۔ ہمارے سامنے موجود ہے۔

نواب وقار الملک نے اس موقع پر اور مضامین بھی لکھے اور خطوط میں بھی غم و غصہ کا اظہار کیا۔ لیکن ان کا ۲۰ دسمبر والا مضمون ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے اسلامی ہندوستان کی سیاسیات کا ایک دور ختم ہوا اور دوسرا دور شروع ہوا۔ نواب وقار الملک نے گورنمنٹ کی ”نئی پالیسی“ دیکھ کر جو رائے دی تھی۔ اُس کی مولانا محمد علی نے کاہرہ میں حمایت کی اور اگلے سال مارچ میں ’مسلم لیگ‘ نے اس پر مہر و توثیق ثبت کر دی۔ اب اربابِ علی گڑھ نے جو پالیسی اختیار کی تھی۔ اُس کی ایک شق (کانگریس سے علیحدگی) کے علاوہ باقی سب سے مولانا شبلی دل و جان سے متفق تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کے علی گڑھ سے اختلافات محض اصول پر مبنی تھے تو اب ان کا خاتمہ ہو جانا چاہئے تھا۔ جس پالیسی کو وہ فقط دل ہی دل یا زیادہ سے زیادہ زبانی گفتگو اور نگاہی خطوط میں کہتے تھے۔ اسے خود اربابِ علی گڑھ نے کھلے بندوں ختم کر دیا تھا۔ اب ایک ختم شدہ سوال کو کھولنا اور گڑے مُردے اکھیرنا بالکل غیر ضروری تھا۔ لیکن مرے کو مارے شاہ مدار۔ جب حریفِ خاک و خون میں لوٹ رہا ہو۔ تو اس سے اچھا موقع اس پر ضربیں لگانے کا اور کیسے مل سکتا ہے؟

جب نواب وقار الملک کے مضمون سے ملک کی فضا بدلتی شروع ہوئی۔ اور کامریڈ اور زمیندار کی طرف سے نئی پالیسی کی پرزور حمایت کی گئی۔ (الہلال ابھی طلوع نہ ہوا تھا!) تو اس مضمون کے چند مہینے بعد شبلی نے لکھنؤ کے مسلم گزٹ میں ”مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس کی پہلی قسط ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کے پرچے میں شائع ہوئی اور چوتھی قسط ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو۔ اسی مضمون میں مسلمانوں کی گزشتہ اور آئندہ پالیسی سے بحث کی گئی تھی۔ مضمون پر زور اور انشا پر دازانہ خوبو سے معمور تھا۔ اس میں نواب وقار الملک کی اس ”غلط منطق“ پر اقرار کیا گیا تھا کہ اگر مسلمان کانگریس میں شامل ہو گئے تو ان کی ہستی فنا ہو جائیگی۔ تیسری قسط میں (جو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے بعد شائع ہوئی) لیگ کے بھی چست فقرے کسے ہیں۔ لیکن یہ اختلافی معاملات ہیں جب کوئی اہل قلم

لے مولانا کی زندگی میں فقط یہی چار قسطیں ہوئی تھیں لیکن چوتھی قسط میں انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کی تائید کرتے ہوئے، مسلمانوں کی بت شکنی اور ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کی بد سلوکی کا اس طرح ذکر کیا کہ ان کے مطابق ان کے ”اعزہ و اجاب بلکہ قریباً تمام قوم“ آزدہ ہو گئی۔ انھوں نے بھی تسلیم کیا کہ ”اس مضمون نے بظاہر میزبان عدل کا ایک پتہ بالکل بھگا دیا ہے“ اور تلانی مافات کے لئے مضمون کی ایک قسط بڑھا دی۔ جس میں یہ لکھ کر کہ ”ہندوؤں کی وفاداری کا زمانہ اکبر سے شروع ہوتا ہے“ اکبر کے اتحاد پر ورکارناموں کو تفصیل سے بیان کیا۔ لیکن کسی مصلحت کی بنا پر مضمون کی یہ قسط شبلی کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی۔ بلکہ چوتھی قسط کے کوئی چار سال بعد اور مصنف کی وفات کے کوئی ایک سال بعد حلیہ طبع سے آراستہ ہوئی۔

کسی مسلک کی حمایت میں قلم اٹھاتا ہے۔ تو ضرور ہے کہ اس کی تحریر میں ایسی باتیں آجائیں۔ جن سے اس کے مخالف اختلاف کریں گے لیکن مسلم گزٹ کے مضمون کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں علی گڑھ پر حملہ ہے۔ یا اس میں سرسید سے بے انصافی کی گئی ہے۔ مولانا شبلی نے سرسید کی کئی خوبیاں بیان کر دی ہیں۔ ان کے زمانے سے اب تک حالات میں جو تبدیلیاں ہوئی تھیں انھیں تفصیل سے گنا دیا ہے اور اپنے بیان کو دلیلوں کی مدد سے مدلل اور واضح کیا ہے۔

مسلم گزٹ کے سلسلہ مضامین کے زیادہ مباحث سیاسی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان پر نقد و تبصرہ ہمارا کام نہیں۔ لیکن ان مضامین میں بعض امور غیر اختلافی اور متفق علیہ بھی ہیں اور ان کا ذکر، شبلی کے سوانح نگار کے لئے بڑا خوشگوار ہے۔ ان میں سے ایک قابل ذکر چیز ان قابل احترام ہندوؤں کے ایشیاء کا بیان ہے۔ جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے صرف قوتِ لامیت پر اپنے آپ کو قومی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے اور جن کا ہندوؤں کی موجودہ ترقی اور عروج میں بڑا ہاتھ ہے۔ شبلی کو خدا نے غیر معمولی قوتِ حسِ عطا کی تھی۔ بعض ذاتی اور قومی اثرات نے انھیں قدیم کا ترجمان بنادیا تھا۔ لیکن وہ بالطبع جدت پسند تھے اور نئے اثرات کے قبول کرنے یا کم از کم چکھنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان کا یہ رجحان طبع انھیں بعض اوقات عجیب و غریب کوجوں میں بے گیا اور ان کی سریرِ المحسوس اور شدتِ احساس نے ان کی قوتِ فیصلہ پر بھی اثر ڈالا۔ لیکن کم از کم اس ذکاوتِ حس کی وجہ سے ان کے لئے نئے رجحانات اور اثرات کا اندازہ لگانا زیادہ آسان تھا اور انھوں نے ہندوؤں کی بعض قابل اخذ خوبیوں کی طرف اس وقت اشارہ کیا۔ جب

مسلمانوں کے قومی اداروں میں ان خوبیوں کا کوئی احساس نہ تھا۔ شبلی اپنے سلسلہ مضامین کی پہلی قسط میں لکھتے ہیں :-

ہم سنتے ہیں کہ گروکل میں تین سو وہ بچے تعلیم پا رہے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی قوم کے ہاتھ فروخت کر دی ہے اور جو باوجود دولت مندی کے زمین پر سوتے اور کبیل اور بھٹے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ پونا میں سروٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم ہے۔ جہاں اس وقت (۲۹) بی۔ اے پائیکس کی تعلیم پا رہے ہیں جو پانچ برس کی تعلیم کے بعد تمام عمر ہندوستان کی خدمت کریں گے اور ان کی کل زندگی کی قیمت (۳۰) روپیہ ماہوار ہوگی۔ ہم واقف ہیں کہ فرگوسن کالج پونا میں (۱۹) پروفیسروں نے جن میں سے کوئی بی۔ اے سے کم تعلیم یافتہ نہیں۔ صرف (۵۵) روپیہ ماہوار پر اپنی تمام عمر فروخت کر دی ہے۔ ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ آریہ کالج اور ہندو کالج میں متعدد ہندو پروفیسر ہیں جو بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتے ہیں لیکن یہ تمام حیرت انگیز آوازیں، یہ تمام پرجوش نمونے، یہ تمام حیرت انگیز واقعات ہمارے دلوں میں ایک ذرہ جنبش نہیں پیدا کر سکتے۔ ہماری قومی درسگاہوں نے آج تک اپنا نفس کی ایک مثال بھی پیدا نہیں کی۔

ان سلسلہ مضامین کی دوسری قابل ذکر غیر اختلافی بات، کونسلوں اور کمیٹیوں میں مسلمان اور ہندو ممبران کے طریق کار کا فرق تھا۔ شبلی کے خیالات و عقائد اختلافات مشکل نہیں۔ ان کی ذاتی سیرت میں بھی آسانی سے پیچ و خم ڈھونڈ سے جاسکتے ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک کامل لفظ اور پختہ کار انسان تھے۔ ان کی زندگی کا تعمیری دور اس عرصہ کی صحبت میں گزرا تھا۔ جس کی نگاہ بلند اور جس کا معیار کڑا تھا اور شبلی اس معاملے میں

اس کے سچے جانشین تھے۔ وہ ”یکے پان“ تھے۔ انھیں نئی نسل کی ادھوری کوششیں اور ”لیج پیج“ باتیں کس طرح گوارا ہوتیں۔ اس کے علاوہ وہ دیکھتے تھے۔ (اور یہ بات آج بھی صحیح ہے) کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی رفتار ترقی میں اس لئے فرق ہے کہ پچھلے پچاس سال سے مسلمان محنت سے جی چڑانے لگے ہیں۔ کونسلوں کے مسلمان نمائندوں کی نسبت شبلی لکھتے ہیں :-

کونسلوں میں ہمارے قائم مقاموں نے کس قسم کے سوالات کئے؟ کیا کیا اصلاحی تدبیریں پیش کیں؟ جن مسئلوں پر گفتگو کی۔ وہ بازاری گفتگو تھی۔ یا کسی ماہر فن کی؟ ہندو ممبر تمام ریکارڈوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور ادبم پہنچاتا ہے اور کوئی اہم۔ دقیق اور نتیجہ نیز سوال کرتا ہے۔ جو عام آدمیوں کے دائرہ معلومات سے بالاتر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا پولیٹیکل قائم مقام کونسل میں نہایت زور شور سے الزام دینے کے لہجہ میں سوال کرتا ہے کہ گورنمنٹ کو معلوم ہے یا نہیں کہ فلاں تختہ خانہ میں دکھانے کے بیٹھنے کے لئے کرسیوں اور مونڈھوں کا انتظام ہے یا نہیں؟ آگے چل کر یہی شکایت انھوں نے یونیورسٹی کے مسلمان ارکان کی نسبت کی ہے :-

یونیورسٹی کو پالیٹیکس سے کوئی تعلق نہیں۔ یونیورسٹی کے فیلو مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہندو ممبر جب یونیورسٹی کے اجلاس میں جاتا ہے تو مسائل زیر بحث پر تیار ہو کر جاتا ہے۔ تمام ریکارڈوں کو ساتھ رکھتا ہے۔ لوگوں کو پہلے سے اپنا ہم رائے بناتا ہے۔ بخلاف اس کے ہماری تعلیم گاہوں کے تربیت یافتہ جلسہ میں جا کر بھی یہ خبر نہیں رکھتے۔

کہ ان کے سامنے کیا ہونے والا ہے؛

شبلی کو یہ شکایت صرف جدید اداروں کے مسلمان نمائندوں سے نہ تھی۔ بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی تھی۔ وہ سید سلیمان ندوی کو اخیر عمر کے ایک خط میں مذہب کی اصلاحی کارروائیوں کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

حالت یہ ہے کہ ایک شخص بھی ایسا نہیں جو قانون اور قاعدہ کو پڑھے۔ اور قانونی حیثیت سے تیار ہو۔ آئین کیل - پگجز - وغیرہ میں صرف لغائی وہ کار ہے۔ وہ موجود ہے۔ باقی اصل مضابطہ اور قاعدہ کی بحث آجاتی ہے تو سب زہ جالتے ہیں۔ ابوالکلام صاحب کا تار آیا کہ تم لکھ کر بھیج دو۔ مجھ پر یہ بہت جبر ہوتا ہے۔

شبلی کے مسلم گزٹ والے سلسلہ مضامین میں، غیر اختلافی، کارآمد باتیں موجود ہیں اور کم از کم ان مضامین کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں علی گڑھ یا سرسید کے ساتھ کسی عداوت یا عناد کا اظہار ہے۔ شبلی نے سرسید اور علی گڑھ کے متعلق جملے بھی پھوٹے پھوڑے کئے لئے مولوی وحید الدین مسلم کے مسلم گزٹ کو نہیں، بلکہ مولوی ابوالکلام آزاد کے الہلال اور نثر نہیں، نظم کو ذریعہ اظہار بنایا شاید جس وقت انھوں نے مسلم گزٹ میں مضامین لکھنے شروع کئے تھے اس وقت ان کے دل میں سرسید اور علی گڑھ کے خلاف وہ غیظ و غضب نہ تھا۔ جو الہلال کے اجرا اور مولوی ابوالکلام آزاد کے با اثر مضامین پڑھنے کے بعد ہو گیا۔ جن کا شروع سے ان باتوں کی نسبت ایک خاص نقطہ نظر تھا اور جنھوں نے ”علی گڑھ کے ایوانِ غلامی“ کو گرا دینا شروع سے ہی الہلال کا مقصد ادنیٰ قرار دیا تھا۔ جہاں تک طرز تحریر کی مختلف اصناف کا تعلق ہے۔ شاید مولانا شبلی

سمجھتے ہوں کہ نثر میں پھر ٹھنڈے دل سے بات کرنی پڑتی ہے۔ (اُردو میں اس وقت تک نیا جذباتی اور انشا پر دازانہ طرز تحریر کسی خاص کامیابی کے ساتھ استعمال نہیں ہوا تھا) اور ممکن ہے۔ خشک دیلوں میں حرفیں کا پلہ بھاری ہو جائے۔ اس کے خلاف نثر کے بجائے مسخر آمیز شعر کا حربہ استعمال کرنا چاہیے۔ جس کا کوئی جواب نہیں اور جس میں اس لطیف طریقے سے وار ہو سکتا ہے کہ دشمن کو پتہ بھی نہ چلے کہ کیا ہو رہا ہے !

مولانا شبلی نے ۱۹۱۲ء کے آخر اور ۱۹۱۳ء کے شروع میں جو وقتی نظمیں لکھیں ان کا ایک حصہ ”مسلم لیگ“ کے متعلق ہے جس میں لیگ کے نئے مقصد ”سوئیل سیلف گورنمنٹ“ کے لفظ سوئیل کو استہزا و مسخر کا نشانہ بنایا ہے۔ کلیات شبلی میں ان نظموں کے شروع میں سید سلیمان ندوی کا ایک پیرا گراف درج ہے جس میں اس زمانے کے حالات بیان کر کے مسلم لیگ کے خلاف تحریک ابھارنے میں شبلی نے جو حصہ لیا تھا۔ اس کا ذکر کیا گیا ہے اور لکھا ہے۔

بالآخر یہ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ لیگ مر گئی۔

آج لیگ کی زندگی، بلکہ شان و شوکت دیکھ کر شاید بعض ناظرین کو سید سلیمان کے اس فقرے پر ہنسی آئے اور فی الواقع یہ فقرہ الفاظ کے استعمال

۱۔ فقط الہلال کے پانچویں نمبر میں ”نظرے خوش گذرے“ کے عنوان سے کشاف (شبلی) نے، نثر میں ایک عجوبہ مضمون لکھا تھا جس میں علی گڑھ کی تطبیق ”الحاد و غلامی“ اور ”فرنگی محل کی فرنگی عربی“ پر طعن کئے گئے تھے لیکن ایک مضمون کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اور شروع سخن کا راستہ اختیار ہوا۔

اور میان واقعات میں اربابِ ندوہ کی غیر معمولی احتیاط کا ایک ستھرا نمونہ ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شبلی کی نظموں کا قوم کے ایک طبقے پر کافی اثر پڑا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خیالات سے قطع نظر شبلی کی اس زمانے کی نظمیں فنی نقطہ نظر سے اس درجہ کامیاب ہیں کہ ان کا موثر ہونا ناگزیر تھا۔ شبلی نے ممبئی کی فارسی غزلیں لکھنے اور وہاں کے کوئے محبت میں سیر کرنے سے پہلے بھی اردو نظمیں لکھی تھیں مگر سوائے مثنوی صبحِ امید کے باقی سب ”تبرکاتِ شبلی“ ہیں لیکن اس واقعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندو زبان کھل گئی ہے۔ حافظ کی نسبت ایک قصہ مشہور ہے کہ شاخ نبات سے محبت کرنے کی بدولت ان کی زبان رواں ہو گئی اور ان کے اشعار میں تراوی درد آگیا۔ پتہ نہیں شبلی پر بھی کوئی ایسا عمل کارگر ہوا لیکن اتنا ضرور صحیح ہے کہ چین زارِ ممبئی میں گلِ چینی کے بعد ان کے اشعار میں ایک خاص نفاست شکی اور دل آویزی آگئی۔ اس کے بعد انھوں نے اگر لنگر ہی ٹھاکر دشمن کی طرف پھینک دیں تو وہ پھول بن گئے ہیں۔ ان کے الفاظ کا انتخاب ترکیبوں کی چستی اور طنزیہ طرزیان بالکل بے پناہ ہے۔ ”شعرِ مخالف تیر و شکر کا اثر رکھتا ہے اور پھر گرفت کی کوئی چیز نہیں“۔ شبلی کی سیاسی نظموں سے بحث ہمارے دائرہ غور و فکر سے باہر ہے۔

لیکن شبلی کے سوانح نگار کے لئے وہ نظمیں جن میں وہ علانیہ اپنے قدیم محبوبین سرسید اور علی گڑھ کے خلاف صفت آرا ہوئے۔ بڑی دلچسپی رکھتی ہیں اور ان کا مطالعہ کئے بغیر اس انقلاب کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ جو شبلی کے خیالات میں ہوا اور جسے شبلی ان نظموں کی مدد سے قوم کے خیالات میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان نظموں کا زیادہ حصہ اُس وقت لکھا گیا۔ جب ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا سوال

درپیش تھا اور شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد اس بات پر مصرعے کہ مسلم یونیورسٹی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے جس قدر کالج اور اسکول ہیں۔ ان سب کے الحاق کا اختیار ہونا چاہیے۔ شبلی کی نظموں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں سے باقی قوم بھی اکی جھپال ہو گئی۔ لیکن حکومت صوبہ بھارتی یونیورسٹیوں کی موجودگی میں علی گڑھ یونیورسٹی کو یہ حق نہ دیتی تھی اور شاید علی گڑھ میں بعض لوگ آمادہ ہو گئے (جیسا کہ ہندو یونیورسٹی کی بنیاد کے بعد انھیں بالآخر کرنا پڑا) کہ اس حق کے بغیر ہی یونیورسٹی شروع کر دیں۔ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی سے جو ملی محبت ہو سکتی تھی۔ اس کا اندازہ دینا نہیں۔ لیکن وہ کہتے تھے کہ جب قوم نے یونیورسٹی کے لئے چندہ دیا اور قوم ایک الحاقی یونیورسٹی کے حق میں ہے تو علی گڑھ والوں کو اس کا کوئی استحقاق نہیں کہ وہ ایک مقامی یونیورسٹی قبول کریں۔ مولانا نے اس موضوع پر ایک طنز یہ نظم لکھی جو ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں شائع ہوئی۔ اس کا ایک بند ہے۔

ان اہلہان قوم کو سمجھائے یہ کوئی عالم کے کاروبار کا اکل تنظیم ہے
جس کی بنیاد تمام ہے تقسیم کا ربر یعنی ہر ایک شخص کا خاص کام ہے
عالم میں ہیں ہر ایک کے فرائض جدا جدا یہ مسئلہ مسئلہ خاص و عام ہے
ہے مقتدی کا فرض فقط امتثال امر ارشاد و حکم منصب خاص مام ہے
تھا قوم کا جو فرض وہ تھا بس عطائے زر آگے مقدسین علی گڑھ کا کام ہے
یہ بارگاہ خاص۔ نہیں مجلس عوام سمعاً و طاعتاً یہ ادب کا تقاضا ہے

مخصوص ہیں مناصب خاصان بارگاہ

تم کون ہو جو تم کو یہ سودائے عام ہے؟

ایک اور نظم کا عنوان تھا۔ ”مسئلہ الحاق“ اس کے چند شعر ہیں۔
 مجھ کو حیرت تھی کہ تعلیم غلامی کیلئے وہ نیا کونسا پہلو ہے کہ جو باقی ہے
 پہلے جو بزم گہ خاص تھی اس فن کیلئے آج جو کچھ ہے اسی درس کی مشائی ہو
 اسکے ہوتے ہوئے پھر لیک کی حاجت کی گئی جب ہی بادہ نکلے ہو وہی ساقی ہے
 تیغ صاحب نے کہا مجھ سے بانداز لطیف اسمیں اک راز ہر اک نکتہ اُتراتی ہے
 یوں تو ہر جامعہ درس غلامی دونوں فرق یہ ہو کہ وہ محدود رہی الحاقی ہے!
 دوسرے شعر میں علی گڑھ کالج کا صاف نام نہیں لیا گیا۔ بلکہ اس کے لئے
 ”بزم گہ خاص“ کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ لیکن ایک رباعی میں ”کالج“
 اور ”خوشامد کا ذکر صاف صاف ہے۔“

۱۔ شبلی نے سرسید کی وفادار اندہ پالیسی کی بنا پر علی گڑھ کو ”جامعہ درس غلامی“ کہا ہے۔ لیکن اگر
 ندوہ کے اوراقِ تاریخِ ذرا تلاش سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس معاملے میں یہ علی گڑھ
 بھی بڑھا ہوا تھا اور ندوہ کے سفیرِ باقاعدہ اطاعت حکومت کا وعظ کیا کرتے تھے!
 ۱۹۰۵ء کے اندوہ میں جس کے مولانا شبلی ایڈیٹر تھے۔ مولوی غلام محمد مشلوی دکن
 ندوۃ العلماء کی ایک نا آموز تقریر کا ذکر کر کے ندوہ کی پالیسی پر حسبِ نیل لفاظیں روشنی ڈالی گئی ہے:-
 ”ندوہ اگر جیپاٹیکس سے بالکل الگ ہے۔ لیکن چونکہ اس کا اصل
 مقصد روشن خیال علما کا پیدا کرنا ہے اور اس قسم کے علما کا ایک ضروری
 فرض یہ بھی ہے کہ گورنمنٹ کی برکاتِ حکومت سے واقف ہوں اور ملک
 میں گورنمنٹ سے وفاداری کے خیالات پھیلائیں۔ اس لئے مولوی صاحب
 نے ندوہ کا فرض ادا کیا۔ ندوہ سے اور سفر اور وکلا بھی موقع بہ موقع
 اس فرض کو انجام دیتے رہتے ہیں۔“

کامیابی میں بس اک ادھ برس باقی ہے لیگ سے سلسلہ کانگرس باقی ہے
 اب بھی آجاتی ہو کالج سے خوشامد کی صدا چاچکا قافلہ اب بانگِ جرس باقی ہے
 لفظ ”کالج“ کی تشریح کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن کلیاتِ شبلی کے مرتب
 سید سلیمان ندوی ان باتوں میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ انھوں نے
 اس پر ایک حاشیہ چڑھا کر نمایاں نمایاں تر کر دیا ہے۔ ”علی گڑھ کالج“ جواب
 علی گڑھ یونیورسٹی ہے“

اسی مسئلہ الحاق کے سلسلے میں ایک نظم ہے۔ ”معرض نیاز بہ جناب الملک“
 اس میں ادبِ بابِ علی گڑھ حکومت کے سامنے سر بسجود ہو کر عرض کرتے ہیں۔
 ہم تو ازل سے حلقہ بگوش نیاز ہیں یہ سر ہمیشہ زیرِ قدم پائمال ہے
 ہم نے تو دودھ و دنا و صفت کی حضور کی جو خاص شیوہ صفت ذوالجلال ہے
 آیا کبھی نہ حرتِ تمت زباناں پر یان تک تو ہم کو پاسِ ادب کا خیال ہے
 اُد کے باب میں جو ذرا کھل گئی زباں اب تک جبیں پر عرقِ انفعال ہے
 دامنِ غبارِ حقِ طلبی سے رہا ہے پاک یہ فیضِ خاص نہ ہر دیرِ مینہ سال ہے
 آیا جو حریت کا کبھی دل میں دہم بھی سمجھا دیا کہ جوشِ جنوں کا اُبال ہے
 اب تک اسی طریق پہ ہیں بندگانِ خاص گو صحبتِ عوام میں کچھ قیل و قال ہے
 الحاق سے کچھ اور نہ تھا مدعاے خاص بس اک عمومِ درس و فقا کا خیال ہے
 یعنی کہ پھیل کر یہ زمانے کو گھیر لے اب تک جو مختصر یہ علی گڑھ کا حال ہے

پانچویں شعر میں ”ہر دیرِ مینہ سال“ سے مراد وہی ”پیرِ دیریں“ ہے جس
 کے متعلق شبلی نے کوئی پچیس سال پہلے مثنوی صبحِ امید میں لکھا تھا۔

دیکھا تو وہاں بہ جاہ و تمکین آیا نظر اک پیرِ دیریں
 صورت سے عیاں جلالِ شاہی چہرے پہ فروغِ صبحِ گہری

وہ ریش دراز کی سپیدی چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم توقیر کی صورت مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا وہ قوم کی ناوٹ گھننے والا

ارباب علی گڑھ پر سب سے مسلسل طنز ایک نظم میں ہے جس کا عنوان تھا
”مذہب یا سیاست“ لیکن اگر اس کا عنوان ہوتا تو ارباب علی گڑھ سے
خطاب ”تو شاید نفس مضمون زیادہ واضح ہو جاتا۔ اس نظم کے بعض شعرا ہیں
تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو دوہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبہ دینی تھا کہ جس نے دم میں کر دیا ذلّت افسردہ کو ہمرنگ شرار
یا کوئی جاذبہ ملک وطن تھا جس نے کر دئے دم میں تو اے عملی سب بیدار
آپ دونوں سے کئے دیتے ہیں ہم کو محروم نہ سیاست نہ ناموس شریعت کا وقار
ماتوں بحث سیاست کی اجازت ہی نہ تھی کہ وفاداری مسلم کا تھا یہ خاص شعار
اب اجازت ہے گردائے بحث ہے یہ کہ گورنمنٹ سے اس بات کے ہوں عرض گزار
ہم کو پامال کئے دیتے ہیں ابنائے وطن ڈر ہے پس جلے نہ یہ فرقہ اخلاص شعار
اب رہا جذبہ دینی تو وہ اس طرح مٹا کہ ہیں آپ ہی آتا ہے اب اس نام سے عار
وضع میں طرد میں اخلاق میں بیت میں کہیں نظر آتے نہیں کچھ حرمت دیں کے آثار
آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار
بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن تھا کہ نہ گھٹتا کبھی ناموس شریعت کا وقار
آج ہریان میں ہے شان تفریح پیدا! آج ہر رنگ میں یورپ کے نمایاں ہیں شعار
ہیں شریعت کے مسائل بھی وہیں تک محدود کہ جہاں تک انھیں معقول بتائیں اغیار
نہ شریعت نہ سیاست تو پھر اس کس کیلئے؟ یہ ننگ دہریہ یہ شورش ہے یہ غل ہے یہ پکار؟
۱۹۱۲ء کے آخر میں شبلی کامرانی کے نقشے میں مجھوم رہے تھے۔ اس سال کے

نصفِ آخر میں کلکتہ سے ان کے محبِ خاص اور رفیقِ کار مولانا ابوالکلام آزاد نے اہلالِ جاری کیا۔ اور چند ہی مہینوں میں اس نے جو اثر و اقتدار حاصل کر لیا۔ اس سے یہ خیال بچا نہ تھا کہ قومی معاملات کی باگ اس کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اور رہے گی۔ نہر کی کے معاملات کو اسلامی ہندوستان کے مسائل پر اہمیت دینے کی جو پالیسی اس نے شروع کی تھی (اور جو سرسید کی پالیسی کے عین مخالف تھی)۔ وہی بالآخر کامریڈ۔ ہمدرد۔ زمیندار کو اختیار کرنی پڑی۔ مسلم یونیورسٹی کے مسئلے پر اس نے علانیہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی سے ٹکرائی تھی اور اس میں کامیاب رہا تھا۔ اس وقت ہر طرف شبلی اور ان کے ہنجباؤں کا دور دورہ تھا۔ شبلی کے جو حریف تھے۔ وہ یا نوکونوں میں چھپے ہوئے تھے۔ یا شبلی اور شبلی کے رفقاء کے اشاروں پر چل رہے تھے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ قومی قیادت کی بساط پر جو بازی شبلی نے کھیلی تھی۔ اس میں وہ کامیاب رہے تھے۔ اس حالت میں اگر ان پر فاتحانہ غرور و تفاخر طاری ہو جاتا۔ تو کیا تعجب تھا۔ اس نشہ آور حالت کا بیان ان کے اپنے پُرکلف الفاظ میں سنئے۔

وہ دن گئے کہ خاک کو دعویٰ نور تھا	وہ دن گئے کہ ننگہ کو کہتے تھے حرم
ہر بواہوسِ خمارِ سیاست میں چور تھا	وہ دن گئے کہ شانِ غلامی کے ساتھ بھی
ہم یا یہ کلامِ سخن گوئے طو رہا تھا	وہ دن گئے کہ "شائعِ اول" کا حرفِ خُش
اس نقشِ سیما میں نظر کا تصور تھا	اب معترف ہیں دیدہ و رانِ قدیم بھی
اک کاسہ تہی یہ سر پر غرور تھا	اس نسبتِ ترغش میں نہ تھی قوتِ عمل
یہ تیرگی تھی جس کو سمجھتے تھے نور تھا	یہ لہوِ سراب نہ تھا چشمہِ مبقا
اخلاص و صدقِ شایہ و سرور و زور تھا	آئینِ بندگی میں مملکت کی شان تھی

ان کی دکان کی وہ ہوا اب بگڑ چلی جن کے گھروں میں جنسِ فا کا دور تھا
 اب یہ کھلا کہ واقعہ تر تھا اسی قدر جو جس قدر مقامِ تقرب سے دور تھا
 ہر دم برادرانِ وطن کی بڑائیاں ظاہر ہوا کہ فتنہ دار باب زور تھا
 سب مٹ گیا سیاست سی سالہ کا ظلم
 اک ٹھیس سی لگی تھی کہ یہ شیشہ چور تھا !



آخری مشکلات و مصائب

شہلی کے لئے ۱۹۱۲ء کا سارا سال اور ۱۹۱۳ء کا آغاز انتہائی کامرانی کا زمانہ تھا۔ ندوہ کا سالانہ جلسہ اکامیاب رہا۔ شہلی کی سب سے بڑی تصنیفی مہم نہایت محنت افزا حالات میں شروع ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حریفوں کے برعکس قضاویوں دھم سے زمین پر آگئے اور ان کے کھنڈر کے بالمقابل شہلی کے خیالات کا دلفریب جمل ساری قوم کو اپنی طرف کھینچے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ دل خوش کن صورت حالات کیا ہو سکتی ہے لیکن قدرت کی تتم ظریفیاں غیب کی ہیں شہلی کو کیا معلوم تھا کہ جو دیوار وہ بلند کر رہے تھے۔ وہ خود اس کی زد میں آجائیں گے اور جو آگ وہ روشن کر رہے تھے۔ وہ سب پہلے ان کی امیدوں کا خرمن تباہ کرے گی!!

شہلی نے قوم میں جوش اور شوق آزادی پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ واقعات نے بھی ان کا ساتھ دیا اور ایک دو سال میں قوم کے خیالات میں ایک انقلاب آگیا۔ شہلی نے اپنے نئے خیالات کا اظہار کلکتہ کے 'الہلال' لاہور کے 'زمیندار' اور لکھنؤ کے 'مسلم گزٹ' میں کیا تھا۔ ندوہ میں ان خیالات کو جگہ دی۔ لیکن مئی ۱۹۱۲ء میں وہ ندوہ کی ادارت سے مستعفی ہو گئے اور کارکنوں نے ان کی جگہ دارالعلوم کے ایک مدرس مولوی عبدالحکیم کو یہ خدمت تفویض کی۔ اس وقت عام جوش اور بے چینی کا زمانہ

تھا۔ اور زمانہ حال کی سیاسی تحریکوں کو مضبوط بنانے کے لئے زمانہ قدیم کی مذہبی ترکیبیں استعمال ہو رہی تھیں۔ مولوی عبدالکریم نے بھی نئے خیالات کا ساتھ دینا چاہا اور اپنی ادارت کے پہلے پرچے میں ہی جہاد پر ایک فقیہانہ طرز کا مضمون لکھا۔ جسے مولانا شبلی نے خلاف مصلحت اور قابل اعتراض قرار دیا اور مقامی اراکین کا ایک جلسہ ٹکا کر انھیں کہا کہ مولوی عبدالکریم کے خلاف بھی کارروائی کی جائے۔ بلکہ ان اراکین کا بیان ہے کہ مولانا نے انھیں دھمکی دی تھی کہ اگر وہ کوئی کارروائی نہ کریں گے تو مولانا یہ معاملہ گورنر تک پہنچائیں گے۔

موج کوثر میں ہم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مولانا کی یہ ساری کوشش مذہب کو عتاب حکومت سے بچانے کے لئے تھی۔ لیکن موج کوثر کی اشاعت کے بعد حیاتِ شبلی شائع ہوئی ہے اور اس میں مولانا شبلی اور مولوی عبدالکریم کے جو تعلقات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ معاملہ ایک مختلف صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سید سلیمان، مولوی عبدالکریم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

موصوف (مولوی عبدالکریم) اچھے خاصے طباع اور ذہین تھے مگر افسوس ہے کہ اس ذہانت کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہ بہت جلد دوسروں کے حلقہ میں آگئے۔ جنہوں نے ان کو فضل و کمال میں مولانا شبلی کا مد مقابل بنا کر کھڑا کیا۔

اس کے علاوہ جب مضمون کی اشاعت اور مقامی اراکین کے جلسے کی تاریخوں پر غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ کارروائی ایک ”مد مقابل“

کی شکست کے لئے تھی۔ نندوہ کو عتابِ حکومت سے بچانے کی کوئی ضرورت پیش نہ
آئی تھی۔ یہ مضمون جون ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا اور مولانا نے جلسہ ۲۸ جنوری ۱۹۱۳ء
کو بڑایا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس مضمون کی بنا پر حکومت کو نندوہ سے کوئی باز پرس
کرنی تھی۔ تو وہ مضمون کے ایک، دو، تین مہینے بعد تک کر لیتی۔ یہ حقیقت اگر سنا
مہینے تک کوئی باز پرس نہ کی گئی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ حکومت یا تو اس مضمون
سے بے خبر تھی یا وہ ایک خشک فقیہانہ مضمون کا جس میں فقط جہاد کے مذہبی مسائل
بتائے گئے تھے۔ نوٹس لینا غیر ضروری سمجھتی تھی۔ صحیح ہے۔ کہ جب خود نندوہ والوں
نے مولوی عبدالکریم کو چھ ماہ کے لئے معطل کر دیا اور مولانا شبلی نے اس فیصلے
کی باقاعدہ اطلاع حاکم ضلع کو دی اور پھر اس کے بعد جلسہ انتظامیہ نے یہ
حکم منسوخ کیا تو اس وقت کشتہ کرنے کہا کہ ایڈیٹر کو ”کچھ نہ کچھ تنبیہ ضروری“ ہے
لیکن سات ماہ تک حکومت کے کوئی نوٹس نہ لینے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر
مولانا شبلی حکام تک یہ معاملہ نہ پہنچاتے تو وہ اس میں کوئی دخل نہ دیتے۔
بہر کیف مولانا اس وقت طبقہٴ احرار کے راہنما تھے اور نہایت پر جوش
مضامین اور تیز تیز نظمیں لکھ رہے تھے۔ جب عوام کو معلوم ہوا کہ آزادی اور
مذہب پرستی کے اس دعویدار نے ایک رکنِ اسلامی پر مضمون لکھنے کی یاد اش
میں نندوہ کے فقیہ اول کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے تو ان کے خلاف لکھنؤ میں ایک
طوفان برپا ہو گیا۔ مولانا کے مخالفین نے جو دیے بھی مولوی عبدالکریم کے طرفدار تھے
جلی پر تیل ڈالا اور قومی اخبارات، مثلاً ”مسلم گزٹ“ نے شبلی کے خلاف سخت
سخت مضامین لکھے۔ مولانا اس ایجنڈیشن سے گھبرا گئے۔ پہلے تو لکھنؤ چھوڑ
کر بمبئی کا رخ کیا اور پھر وہاں سے دارالعلوم کی معتمدی سے اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔

اس کے بعد دوسرے معتدین، مثلاً مولوی عبدالحی اور غشی احتشام علی اپنی معتدیوں سے اور بعض اراکین اپنی رکنیت سے مستغفی ہوئے۔ لیکن جولائی کے تیسرے ہفتے میں جلسہ انتظامیہ ہوا۔ اس میں مولوی خلیل الرحمن صاحب مستقل ناظم بنائے گئے۔ ندوہ کے قدیم محسن کرنیل عبدالمجید خاں سرپرست بنے اور مولوی عبدالحی اور غشی احتشام علی نائب ناظم مقرر ہوئے۔ اب ندوہ کا کام نئے سرے سے باقاعدہ چلنا شروع ہوا۔

شبلی نے جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے استعفیٰ دیا تھا۔ اس کے ایک ہفتے بعد مسجد کانپور کا واقعہ پیش آیا جس نے قوم میں طرابلس و بلقان کی لڑائیوں سے بھی زیادہ جوش پیدا کیا۔ مولوی عبدالکریم کے واقعہ سے طبقہ احرار میں مولانا کی ساکھ کم ہو گئی تھی۔ اب انھیں موقع ملا کہ پھر سے اس طبقے میں داخل ہوں۔ اس وقت تک ان کی سیاسی نظمیں کثافت۔ نقاد یا اس طرح فحش ناموں سے شائع ہوئی تھیں۔ اب انھوں نے علانیہ اپنے نام سے نظمیں شائع کرائیں اور نظمیں بھی پہلے سے کہیں زیادہ جوشیلی، موثر اور اشتعال انگیز تھیں۔ ایک نظم کا جس میں حکومت سے خطاب تھا۔ آخری مصرع تھا۔

آپ ظالم نہیں، زہار پہ ہم ہیں مظلوم!

ایک نظم کا عنوان تھا ”علمائے زندانی“۔

مساجد کی حفاظت کیلئے پولس کی حالت عجب کیا جو اب ہر شاہراہ سے یہ صدائے پنہائی جا رہی ہیں عالمانِ دین کو زنجیریں بھی دس نہیں اگر ہیں کشکانِ خجوا ندازی شہیدانِ وفا کے قطرہ خوں کام آئیں گے

خدا کو اپنے مشکور فرمایا عنایت ہے مجھے بھی کم سے کم اک غسلِ خلی کی ضرورت ہے یہ زیورِ سید ”سجاد“ عالی کی وراثت ہے تو مجھ کو سستی باز فیئے قاتل کی شکایت عروسِ مسجدِ زیبا کو انساں کی ضرورت ہے

عجب کیا ہو جو فیوضِ حسن سے پہلے جانیں میں کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے
شہیدانِ فدا کی خاک سے آتی ہیں آدائیں کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے

ایک اور واقعہ میں اسیرانِ کانپور سے خطاب کیا تھا ہے
ہم قدمِ آب کا ہونا تو بہت ہے دشوار ان کا کیا ذکر جو اس درد میں مل ہی نہیں
یاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ یعنی افسوس میں بخیر کے قابل ہی نہیں

ایک اور قطعہ تھا ہے
اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہوا باقی اگرچہ صدمہ بُلقان سے جگر شق ہے
بچار کھے ہیں مگر میں نے چند قطرہِ مخوں کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے
شبلی نے واقعہ کانپور پر دل ہلادینے والے شعر لکھے لیکن نظم و نثر کے موافق

پر ونا اور بات ہے اور عملی ایثار کے میدان میں اثر نا کار دگر۔ اور فہم سے
اب شبلی کو یہ امتحان پیش آگیا۔ ان کے تیز اور شوخ اشعار سے لکھنؤ کے احرار
میں تو ان کی ساکھ بجال نہ ہوئی۔ لیکن حکومت میں ان کا جو اعتبار تھا۔ وہ جاتا
رہا۔ جنوری ۱۹۱۲ء میں کوئی سرکاری پارٹی تھی۔ جس میں مولانا بھی شریک تھے۔

(ص ۱۸۰ ما آں دارد و این نیز ہم!) نسبت
اس میں لفٹنٹ گورنر صاحب سامنا ہوا تو انھوں نے کانپور کی نظموں کی نسبت
شکایت آمیز بلکہ طعن آمیز فقرے کہے اور چیف سکریٹری نے بھی شکایت کی۔

پارٹی میں تو مولانا نے چیف سکریٹری کی یہ کہہ کر تسلی کرنی چاہی کہ یہ اتفاقیہ
خلاف معمول بات ہوئی۔ ورنہ میں نے تو ہمیشہ بے تعصبی پھیلانے کی کوشش کی
ہے۔ لیکن قیاس ہے کہ شاید حکام ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنا
چاہتے تھے۔ وہ یکم فروری کو حکیم اجمل خاں کو ساتھ لے کر چیف سکریٹری کی
خدمت میں گئے اور معاملے کو صاف کرنا چاہا۔ لیکن وہ اس وقت بھی کبیڈہ خاطر

رہے۔ چنانچہ مولانا نے واپس آکر رات ہی کو ایک رقعہ لکھ کر مولانا عبد الماجد دریا گادی کو بھجوا دیا اور ان سے ایک انگریزی خط لکھوا کر بارگاہِ حکومت میں اپنی صفائی پیش کی۔ مولانا عبد الماجد دریا گادی اس رقعے کی نسبت لکھتے ہیں:-

حضرت ابوالخشب کو ملی۔ میں اسی وقت گیا۔ مولانا بہت دیر تک غلبہ میں گفتگو کرتے رہے۔ ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ آجکل مجھ سے بدظن ہے۔ خصوصاً معاملہ کانپور کے متعلق میری نظموں سے۔ حاذق الملک حکیم اجل خاں مجھے آج مسٹر برن چیف سکریٹری کے پاس لے گئے تھے۔ وہ بہت کبیدہ خاطر تھے۔ حالانکہ اس پیشتر نہایت اخلاق و نفاق سے ملتے تھے۔ تم اس کے نام ایک مفصل جیٹی اس مضمون کی میری طرف سے لکھ دو کہ میں مدتِ عمر بھی انگریزی گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان یگانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے جو غلط فہمیاں مدت دراز سے چلی آتی ہیں۔ دور ہوں۔ چنانچہ اس پر میری تمام تعانیات شاہد ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مشرق و مغرب میں نے اندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اگلاؤں و وفاداری مذہباً فرض ہے اور اسی سالِ ندرہ کے سالانہ جلسہ میں وفاداری کا ایک رزلوشن بھی پاس کر دیا۔ پھر معاملہ مولوی عبدالکریم میں مجھے محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ مضمون کی اشاعت بند کی۔ اخبارات میں گالیاں سننا پڑیں۔ رہا واقعہ کانپور کے متعلق نظمیں تو وہ ایک ہنگامی جوش کا نتیجہ تھیں۔ جس سے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔

اس معذرت نامے سے مولانا کے تعلقات حکومت سے تو بحال ہو گئے۔ لیکن ندوہ بدستور ان کے حیظہٴ اقدار سے باہر رہا۔ انھوں نے استعفیٰ ایک اضطراب کی حالت میں، حرکت مذہبی کے طور پر دے دیا تھا اور اب اپنے اس فعل پر پھرتا رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے شاگردوں سے ایسے مضامین شائع کروانے شروع کئے۔ جن سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس جلسے نے شبلی کا استعفیٰ منظور کیا۔ اسے اس کے منظور کرنے کا اختیار نہ تھا۔ وغیرہ۔ سید سلیمان ندوی۔ مولوی سعید علی نے اس کا خوب پراپا گند کیا۔ لیکن اس کا ندوہ کے کارکنوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد مولانا شبلی لکھنؤ آئے اور ندوہ سے کوئی باقاعدہ تعلق قائم کئے بغیر طلباء کو حدیث بخاری کا درس دینا شروع کیا۔ طلبائے ندوہ کا ایک با اثر طبقہ مولانا کے ساتھ تھا۔ اور ملک کے اخبارات میں ان کے حق میں ایچیٹیشن کر رہا تھا۔ مولانا کے لکھنؤ آجانے سے طلباء میں ایک عام بے چینی پھیل گئی اور ندوہ کے اراکین نے اسے روکنے کے لئے طلبہ کو خارج اوقات میں کسی سے درس لینے کی ممانعت کر دی۔

جب مولانا کے حامیوں کی یہ کوششیں سر نہ ہوئیں۔ تو، مارچ ۱۹۱۲ء کو طلباء نے سڑاٹک کا عام اعلان کر دیا۔ مولانا کا بیان تھا کہ وہ سڑاٹک کے خلاف تھے۔ لیکن مولوی عبدالسلام ندوی نے اس سڑاٹک سے پہلے ایک خط لکھا تھا۔ جس کی نسبت اہللال نے بھی کہا کہ اس خط میں ”جتنے الفاظ لکھے گئے۔ ان میں کوئی لفظ بھی کسی عقلمند آدمی کا لکھا ہوا معلوم

نہیں ہوتا۔ اس میں منجملہ دوسری باتوں کے مولانا احمد علی محدث کی شائع کردہ صحیح بخاری کا معضکہ اڑایا گیا تھا۔ خط کا آخری فقرہ تھا: "اس خط کی خبر کسی کو نہ ہو۔ یہ مولانا کا حکم ہے۔" اور خط میں کہا گیا تھا۔ سرکشی اور سڑائیک کا اوقات آیا تھا۔ اس سڑائیک سے مولانا کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچا۔ مذہبی مدارس میں سڑائیک کا یہ پہلا واقعہ تھا اور ڈر تھا کہ اگر یہ بدعت پھیل گئی۔ تو ان مدارس کے لئے سخت مضر ہوگی۔ علماء نے عام طور پر فتوے دئے کہ یہ سڑائیک ناجائز ہے اور جب مولوی عبدالباری ندوی نے اہللال کلکتہ میں اس کے جوازیں سلسلہ مضامین شروع کیا تو دیوبند کے مولانا بشیر احمد عثمانی نے ان کے خلاف ایک زبردست تردیدی مضمون لکھا۔

سڑائیک کے سلسلے میں دیوبند کے علمائے علانیہ شبلی کی مخالفت کی اور فریق مخالف کا ساتھ دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مولوی خلیل الرحمن زہرا کا ان کے والد اور ان کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے دیوبند میں بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ دوسرے مولانا شبلی، دیوبند کے خلاف کئی جگہ زہرا نقل چکے تھے۔ تیسرے اگر مولانا نے ندوہ کو علی گڑھ کا حریف بنا نا چاہا تھا۔ تو اس کے

لے ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں: "کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرمودہ عہد کو ہم حرم بنائیں گے۔ ایک اور خط میں ہے دارالعلوم (ندوہ) کی کل میں نہایت ذلیل پُرزے لگائے گئے۔ کیا قوم کو اس قدر امیدیں دلا کر دیوبند سے بھی گھٹیا مال دینا چاہئے؟" اندوہ کا ایک نمبر میں سید سلیمان (۹) نے دیوبند اور دوسرے ممتاز عربی مدارس کا ذکر کر کے لکھا: "یہ تینوں مدرسے عصبیت و جمود کے مخزن اور مقصناتِ زمانہ سے بے خبر تھے۔ جہاں سے ہر سال بیسیوں فراغت کے ختم لہرائے ہوئے نکلتے ہیں" (جلد ۴ - نمبر ۲)

ساتھ ساتھ دیوبند کے حریف بھی تھے۔ چنانچہ اس موقع پر ارباب دیوبند نے
بہی طرح منتظین ندوہ کا ساتھ دیا۔ جب اسٹرائک شروع ہو گئی اور مولوی
نسعود علی ہڑتالی طلباء کو لے کر الگ مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ تو مولانا نے
انہیں لکھا:-

تم نے مدرسہ الگ کر لیا اور فرض کرو۔ چند روز جلا بھی سکے تو بحث یہ ہے
کہ کب تک؟ اور اس سے ان کو کیا نفع ہوگا۔ وہ دیوبند وغیرہ سے لونڈے
بوالیں گے۔

جب یہ اسٹرائک بھی کامیاب ہوتی نظر نہ آئی۔ تو مولانا کے حامیوں نے
دہلی میں مجلس اصلاح ندوہ کا ایک عام جلسہ بلانا چاہا۔ اس سے مولانا کے مخالف
بھی زیادہ سرگرم ہوئے اور انھوں نے جلسے سے پہلے بعض علما کے فتوے
شائع کئے۔ جنھوں نے علم الکلام اور کلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر شبلی کو
کافر قرار دیا تھا ان فتوؤں کی نسبت مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں:-

جلسہ کے دن چار فتوے الگ الگ تقسیم ہو رہے تھے۔ جو مولوی عبدالحق
(مفسر تفسیر حقانی) سے تیار کرائے گئے تھے۔ سوائے ندوہ کے ذریعے اور
شہر میں ان کی اشاعت کرائی گئی۔ چنانچہ رائے بریلی کی دیوار سے ایک

صاحب اتار کر میرے پاس لائے۔

اصلاحی کانفرنس کا جلسہ دہلی میں ۱۹۱۴ء کو مولوی شمس الدین امرتسری
کی صدارت میں منعقد ہوا۔ دونوں فریق اور ان کے حمایتی جلسے میں
موجود تھے۔ ندوۃ العلما کے معاملے میں مولانا کے سب سے پرجوش ساتھی
یا ان کے شاگرد اور رفقاء کار (مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد) تھے۔ زیادہ
لوگ جو طوقہ علماء سے باہر تھے (مثلاً نواب سید علی حسن خاں، خواجہ غلام نقیون

مرزا حیرت دہلوی۔ سید جالب دہلوی) ملک کے اکثر علما (مثلاً فرنگی محل کے مولانا عبدالباری۔ دہلی کے مولوی عبدالحق حقانی۔ پھولادی شریف کے شاہ سلیمان۔ دیوبند کے مولانا محمود الحسن) مخالفین شبلی کے ساتھ تھے۔ ان میں سے بعض جلسے میں تشریف نہ لائے تھے لیکن پھر بھی شبلی کے مخالفین کثیر تعداد میں موجود تھے اور ان میں فقط علما نہ تھے بلکہ علی گڑھ کے اربابِ حل و عقد بھی (مثلاً نواب حاجی محمد اسحق خاں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں) جو علامہ شبلی کی طنز گوئی کے زخم خوردہ تھے۔ جلسے میں شریک تھے۔ اور مولانا شبلی کے خلاف قدیم اور جدید دونوں کے ترجمان جمع تھے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

مدارس کی عام ڈسپلن اور کارکنانِ مدارس کی ہمدردی کے نام سے علی گڑھ کالج کے اربابِ اقتدار اور مدرسہ دیوبند کے علما بھی مدعیوں کے ساتھ تھے۔ شبلی کے خلاف علما اور اربابِ کالج کی یہ تنفقہ صفت آرائی بڑی عبرت آمیز ہے۔ جب شبلی قومی خدمت کی وادی میں راہِ پیا ہوئے۔ تو انھوں نے دعوے کیا تھا کہ وہ قدیم اور جدید کے درمیان سنگم کا کام دیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ قدیم اور جدید کے درمیان ایک رابطہ اتحاد قائم کرنے کے بجائے انھوں نے دونوں سے کچھ اس طرح کی بے رخی برتی کہ دونوں ان کے خلاف ہو گئے اور اب وہ شبلی کی راہنمائی میں نہیں بلکہ ان کی مخالفت میں یکدل و یک زبان تھے! ۱۷

شادم کہ برانکارِ من شیخ و برہنِ گشتہ جمع
کز اختلافِ کفر و دین خود خاطرِ من گشتہ جمع
شبلی کی زندگی میں عبرت و نصیحت کا بڑا سامان ہے۔ ان کی سیرت میں

ایک دو چیزیں نظر کو کھٹکتی ہیں۔ لیکن اگر انہیں ایک کمزور صحت اور کمزور اعتقاد والے انسان کی فروگزاشتیں سمجھ کر یا علم و ادب کے ایک مستقلی آئینہ کا رنگ خیال کر کے نظر انداز کر دیں تو دیکھنے والے کو شبلی کی زندگی میں قابلیت - ایثار - بلند ہمتی - مسلسل جدوجہد - فنی پختہ کاری - حب قومی - دعاء مالک دخیل ماصفا - دولت کی بے قدری نفاست پسندی اور شظیم اوقات کے بڑے کارآمد سبق ملتے ہیں۔ بالخصوص جو کوئی ادب کو بطور ایک فن کے اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے جدید اردو نثر میں فقط دو ہی لائق تقلید استاد ہیں۔ آزاد اور شبلی۔ لیکن شبلی کی زندگی میں دوسروں کے لئے عبرت بھی ہے اور اس سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ سچی قومی خدمت کے لئے قابلیت - ایثار - شدید مذہبی حیثیت اور ذہن باتدبیر کافی نہیں۔ شبلی میں یہ سب کچھ بدرجہا موجود تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی قومی زندگی نہ صرف ان کے لئے سوانح روح بنی رہی بلکہ اس کی وجہ سے قوم میں علما و اکابر اور قدیم و جدید کے درمیان غیر ضروری اور مضر اختلاف کا وہ دروازہ کھلکا جو آج تک بند نہیں ہوا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جہاں شبلی میں بڑی خوبیاں تھیں وہاں سیرت کے ایک دو بنیادی نقص بھی تھے اور سچے قومی خادم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی روحانی پاکیزگی اور اخلاقی سر بلندی کا سامان کر کے اپنے آپ کو قومی خدمت کا ایک بے عیب ائمہ کار بنائے۔ اسے چاہئے کہ وہ ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کر کے دیکھتا رہے کہ جس راہ پر وہ چل رہا ہے۔ اس میں اس کی (پہناں) انانیت اور اس کی ذاتی طبعی کمزوریوں کو دخل تو نہیں۔ شبلی کے ”نور اشتغال جذبات“ اور ”مناظرانہ عادتیں“ انہیں ایک لئے و لئے شبلی کے متعلق یہ دونوں جملے جانشین شبلی، سید سلیمان ندوی کے ہیں۔

ایسی راہ پر لے گئے جس سے قوم میں ایک مہلک کشمکش کا آغاز ہوا۔ اس سے ندوہ کو بھی نقصان پہنچا اور شبلی کی ذاتی مخالفت کا بھی ایسا سامان ہوا کہ ہر خیال کے لوگ ان کے خلاف صف آرا ہو گئے! اصلاح ندوہ کے نام سے دہلی میں جو جلسہ ہوا۔ اس میں مولانا محمد مروج بھی شریک تھے اور اس زمانے میں ان کا قومی معاملات میں بڑا دخل تھا۔ انھوں نے حالات کو دیکھ کر اور فریقین سے مشورہ کرنے کے بعد ایک تو سٹرائیگ کو ختم کرنے کا انتقام کیا۔ اور دوسرے یہ طے کیا کہ کھیلے واقعات کی تنقید شروع کر کے کشمکش کو طول نہ دیا جائے۔ بلکہ آئندہ کے لئے زہیہ کی قوت بڑھائی جائے اور ایسے قاعدے جاری ہوں جن سے منتظمین ندوہ کو خود مختار نہ کارروائی کا موقع نہ ملے۔

شبلی کو مولانا محمد علی کے طریق کار سے مایوسی تو ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس کے مطابق نہ انھیں استعفا واپس ملتا تھا اور نہ ہی موجودہ کارکنوں میں تغیر ہوتا تھا۔ لیکن انھوں نے ساری کارروائی اصلاح ندوہ کے نام پر اٹھائی تھی اور اصلاح کا تعلق آئندہ سے ہوتا ہے۔ ماضی سے نہیں۔ اس لئے یہ اصول کی بنا پر کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ جلسے میں ان کے مخالفوں کا اتنا زور تھا کہ جو کچھ مولانا محمد علی تجویز کرتے تھے۔ اس سے زیادہ کامیابی محال تھی۔ چنانچہ انھیں بھی اس طریق کار سے اتفاق کرنا پڑا اور ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ تاکہ وہ ندوہ کے لئے ایک ایسا نیا دستور العمل بنائے جس سے کسی کو پھر مستبدانہ کارروائی کا موقع نہ ملے۔

مولانا شبلی نے جلسے کے سلسلے میں کوئی ڈھائی تین مہینے دہلی میں قیام کیا۔ لیکن اس میں انھیں حسب دلخواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ندوہ میں

ان کے حریف ویسے ہی ویسے برسرِ کار رہے اور اصلاحی کمیٹی ان کی زندگی میں کوئی قابلِ ذکر کام نہ کر سکی۔ اس دوران میں نظر کی پھانس کا سامان کثرت سے متاثر ہا۔ جب وہ ندوہ سے علیحدہ ہوئے تو ریاست بھوپال نے ندوہ کی بدانتظامی کی بنا پر اپنی امداد روک لی تھی۔ اس پر صاحبزادہ آفتاب احمد نے ایکونسل کانفرنس کی طرف سے بقول سید سلیمان ندوی ”معاملات کی تحقیقات کے بہانہ سے ایک کمیشن بھیجنے کی تجویز پیش کی جو موجودہ منتظمین کے موافق لیا جائے۔“ جس کو وہ سرکار بھوپال اور گورنمنٹ میں پیش کر کے مسدود امداد کو دوبارہ جاری کر سکیں، شبلی کو اس تجویز کا زیادہ رنج تو اس لئے تھا کہ اس کے ذریعے منتظمین کو مسدود امداد دیں مل جائیں گی اور ان کے ہاتھ اور مضبوط ہو جائیں گے۔ دوسرے اگرچہ کمیشن کے بھیجنے سے علی گڑھ والوں کا واحد مقصد اربابِ ندوہ کی مدد تھا اور یہ وفد اربابِ ندوہ کے ایما پر بھیجا گیا۔ لیکن شبلی کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ علی گڑھ کانفرنس کے ارکان (اعضاء) ان کے اس ندوۃ العلوم کا معائنہ کریں جسے وہ علی گڑھ کا دمِ مقابل، بلکہ کامیاب حریف سمجھتے تھے۔ انھیں اپنے خواب کی یہ تعبیر پریشاں دیکھ کر دلی رنج ہوا اور انھوں نے ”ندوۃ العلما اور رنگِ معائنہ اغیار“ کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کے چند شعر ہیں۔

کیا شان یزدی ہے کہ وہ ندوۃ علوم	جو مدعی رہبری روزگار ہے
جو ایہ اُمید ہے نسلِ جدید کا	جو کاروانِ رفتہ کی اک یادگار ہے
جس پر حسنِ ظن ہے کہ ہے مجمعِ کرام	جس کا کہ مہرِ شام میں بتکِ قار ہے
آیا تھا جسے شوق میں وہ قابلِ عرب	جس کا مرقع ادبی المنار ہے
چلتے ہیں جسے نقشِ قدم پر حریف بھی	گو اعترافِ حق سے ابھی انکو عار ہے

جس نے خطابت عربی کو دیارِ وِاج جو فنِ جرح و نقد کا آموزگار ہے
 جس نے بول و باموش و شیوہ قدیم یہ انقلاب گردش لیل و نہار ہے!
 آتے ہیں سبکی جاچ کو نا آشنائے فن جو رہے طریقہ اصلاح کا رہے!
 ہم اس تحریری عرصہ داشت کا ذکر کر چکے ہیں۔ جو علامہ شبلی نے مولانا عبد الجبار
 دہلوی سے انگریزی میں لکھوا کر چیف سگریٹری صوبجات متحدہ کے حضور میں
 پیش کی اور جس میں اپنی وفاداریوں کے ثبوت گنائے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا۔
 تو اس کے بعد ”احراری“ سیاسیات سے کنارہ کش ہو جاتا۔ یہ ظاہر تھا کہ
 قوم نے جو نیا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس پر چلنے کی مولانا میں ہمت نہ تھی۔
 لیکن شبلی بہ یک وقت مختلف معبودوں کی پرستش میں مہارت تامہ رکھتے
 تھے۔ ان کے معافی نامہ کا دو تین افراد کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ قوم اس
 سے یکسر ناواقف تھی۔ وہ ایک ایسی تحریر کو اپنے کاموں اور تحریکِ حریت
 کی راہنمائی میں کیوں محفل ہونے دیتے؟

اب انھوں نے سیاسیات میں اور بھی بڑھ چڑھ کر قدم مارنا شروع
 کیا۔ بلکہ علی گڑھ کے طبقہ احرار پر بھی حتم نمائی کی ضرورت
 نو ارا تلخ تر سے زن چودوق نغمہ کم یابی!

۱۹۱۲ء سے اسلامی ہندوستان کے خیالات میں جو انقلاب پیدا ہوا تھا
 اس سے مولانا شبلی کو خوشی تو بے حد تھی لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ علی گڑھ
 کے ویران ہو جانے سے شبلی کا ندوہ آباد نہ ہوا بلکہ واقعات ایسے پیش آئے
 کہ ندوہ بھی شبلی کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس سے طرفہ تر متاثر شدہ یہ پیش آیا کہ
 حریت و حق طلبی کے میدان میں بھی ندوہ سے وہ لوگ بازی لے گئے۔
 جنھیں شبلی کا رخا نہ غلامی کی پیداوار کہتے تھے۔ وہ خود ایک خط میں
 (فٹ نوٹ صفحہ ۲۴۲ پر ملاحظہ ہو)

لکھتے ہیں:-

علی گڑھ کے لڑکے اب ہم لوگوں سے بھی آگے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی حالت شوریدگی تک پہنچ گئی ہے۔ آزاد وہاں جائیں۔ تو لوگوں کی گاڑی کھینچیں۔ اس کے علاوہ میدانِ قیادت میں بھی بالآخر علی گڑھ کا پلہ بھاری رہا۔ تو ان کی نئی سیاسیات میں علی گڑھ کے ترجمان مولانا محمد علی تھتے اور شبلی کے نمائندے ان کے شاگرد رشید، مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا محمد علی کو بعض امور میں آزاد کے نقش قدم پر چلنا پڑا۔ لیکن جو قبولیت اور شہرت عامہ انھیں حاصل تھی۔ ابوالکلام کو کبھی نصیب نہیں ہوئی اور قومی قیادت کا سہرا انھیں کس سر نہ بھا۔ مولانا شبلی کا دل یہ دیکھ کر جلتا تھا کہ نئے میدان میں بھی حریف بازی لے گئے اور وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے۔ جس سے انھیں علی گڑھ کے طبقہٴ احرار پر انگشت نمائی کا موقع ملے۔ ہنگامہ کانپور کے خاتمے نے اس کا بھی سامان کر دیا۔ یہ واقعہ بڑی کشمکش کے بعد اس طرح ختم ہوا تھا کہ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے صوبہ کے گورنر کی رائے کے خلاف مسلمانوں کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس پر مسلمانوں میں ان کے لئے بڑا جذبہٴ احسان مندی پیدا ہو گیا اور مسلمان راہنماؤں نے، جن میں (سوائے مولانا

(صفحہ ۲۴۱ کا فٹ نوٹ ملاحظہ ہو)

اسے فی الحقیقت اس میں تعجب کی کوئی بات نہ تھی۔ علی گڑھ میں گرو فاداری کی تلقین ہوتی تھی تو اس سے کہیں زیادہ قومی محبت کا سبق ملتا تھا اور فاداری کی تلقین بھی اسلئے تھی کہ اس میں قومی مصلحتیں پہنایاں تھیں۔ بقول نواب قارا ملک، فاداری عرض تھی۔ جو ہر نہ تھی۔ یہ پالسی مقصود بالذات نہ تھی۔ بلکہ اس کی بنیاد اور چیز (قومی مصلحت) پر تھی۔

ابوالکلام آزاد کے ہر طبقہ و خیال کے لوگ شامل تھے اور جن میں مولانا محمد علی اور شوکت علی بھی شریک تھے۔ والسراے کی خدمت میں ایک شکریے کا ایڈریس پیش کیا۔ اس موقع پر مولانا شبلی نے گرم گرم اشعار لکھے۔ تاکہ فریق ثانی کے طبقہٴ احرار سے قوم کو بذطن کریں۔ انھوں نے اس موقع پر جو نظمیں لکھیں۔ ان کے دیباچہ میں سید سلیمان ندوی کہتے ہیں: ۵۷

۲۵ اپریل ۱۹۱۲ء کو حزب الاحرار کے بعض سرگرم ارکان کی سرکردگی میں والسراے کی خدمت میں ایک وفد حاضر ہوا اور صلح کانپور کے متعلق شکریہ اور مسلمانوں کی وفاداری کا ایک ایڈریس پیش کیا۔ فرقہٴ احرار کی دوسری جماعت کے ارکان نے اس میں شرکت نہیں کی اور اس طریقہ کار سے اختلاف کیا۔

شبلی کی ایک نظم کا عنوان تھا "فرقہٴ حق و باطل"۔ اس کے بعض اشعار سنئے:

احرار اور مدعیان وفا ہیں اور	دونوں کا ہے طریقہٴ سود و زبیاں الگ
دونوں کا منہ تہائے نظر ہے جو مختلف	ہے خود بخود ہر ایک کا طرزِ بیاں الگ
اس پر بھی صاف صاف نہ تھا امتیازِ حق	کھلتا نہ تھا کہ کون الگ ہے کہاں الگ؟
دہلی کی انجمن نے وہ پردہ اٹھا دیا	قائم ہوا جو معرکہٴ امتحان الگ
اصیان ہو گیا حق و باطل میں امتیاز	اب فصلِ نو بہار الگ ہے خزاں الگ
اب آفتابِ صدق گہن سے نکل گیا	اب شمعِ دلفروز الگ ہے۔ دھواں الگ
وہ احتلاطِ درد و غم سے صاف اب نہیں	گم کشتگانِ راہ سے ہے کارواں الگ
جو لوگ ہیں متاعِ خوشامد کے مایہ دار	کھولیں اب وہ ملک میں پتی دکان الگ

یہ مختصر فسانہ بزمِ شبینہ ہے
سنئے گا اہلال میں یہ داستاں الگ!

ایک اور نظم میں انھوں نے کہا ہے ۷
سچ تو یہ ہے کہ وفا کیشِ زل میں ہم لوگ ہم کو شکوہ نہیں آئیں جہان بانی کا
ہم نے یہ لکھ کے جودی آپ کو تحریر دنا پیشی ہے ہماری خطِ پیشانی کا
شبلی نے شکرے کے ایڈریس کو تحریر دنا کہا اور اپنی اس تحریر وفا کو
بھول گئے جو انھوں نے اس سے کوئی دد مہینے پہلے چیف سکرٹری حکومت صوبہ
مسجدہ کے حضور میں پیش کی تھی لیکن اس موقع پر نوعلامہ نے کمال کر دیا۔ یوں
تو ان کا تمام عمر دستور العمل یہی تھا کہ ۷
رات کو پی گئے اور صبح کو توبہ کرنی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی!

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کا یہ شعر خاص ان کے لئے لکھا گیا ہے
معتشوق ماہِ شیوہ ہر کس موافق مست با ما شراب خور دو بہ زاہد نماز گرداں
لیکن اس وقت انھوں نے جو کچھ کیا اس کے تصور ہی سے عقل دنگ
رہ جاتی ہے۔ اس موقع پر انھوں نے پینے اور توبہ کرنے کے لئے شراب خوری
اور اداۓ نماز کے لئے مختلف اوقات کا انتظار نہیں کیا۔ بلکہ وہ بہ یک
وقت بادہ نوشی اور تہجد خوانی میں مشغول تھے! عین اس زمانے میں جب
قومی اخباروں میں مولانا شبلی دوسرے نامیوں کا برفِ پہن کر وفد میں شریک
ہوتے اور ایڈریس پیش کرنے والوں پر طعن و تشنیع کے تیر چلا رہے تھے اور
ان کی غلامانہ ذمہ داری کا مذاق اڑاتے تھے۔ ٹھیک اسی وقت وہ خود اس وفد
میں شامل تھے اور تحریر دنا پیش کرنے والوں میں پیشا پیش تھے!

یکم اپریل ۱۹۱۷ء کے اہلال میں مسلم وفد کے ۸ ممبران کی جو فہرست تھی ہے۔ اس کے شمارہ ۴۹ پر ”شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی“ کا نام نامی اور اسم گرامی درج ہے!!

خدا کی شان ہے۔ یہ ان بزرگوں کے کارنامے ہیں۔ جو مذہب کے سرپرست بنے ہیں۔ جو قوم کے ان محسنوں کو خوشامد اور غلامی کے طعن دیتے ہیں۔ جن کی زندگی کی پاکیزگی اور یک رنگی کی قسم کھانی چاہئے اور طرفہ تر متاثر شاہ ہے کہ لوگ فخر طعقبت سے انھیں اسلام کا محافظ اور ترجمان مان لیتے ہیں۔

پری نہفتہ رخ و دیو در کمر شمش و ناز
بسوخت عقل نہی رت کہ اس جہر بوالعجبی است!

اپنے حریفوں کو زک سپینے کے لئے شبلی نے موقع تو اچھا تانا کا تھا۔ لیکن کاغذی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی۔ ان کا افسوس کا رگرنہ ہوا اور قوم کی عنان قیادت مولانا محمد علی کے ہاتھ میں ہی رہی!

شبلیؒ کو اگر قوم کی عنان قیادت کے اپنے ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس تھا۔ تو انھیں اتنا ہی افسوس ملک کی نئی نئی فضا اور قوم کے نئے رنگ کا تھا۔ انھوں نے اس فضا کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا۔ لیکن انھیں یہ خیال نہ تھا کہ قوم میں اس قدر متوج اور ہیجان پیدا ہو جائے گا۔ وہ بالطبع ایک جوشیلے اور جذباتی انسان تھے۔ لیکن نامساعد حالات اور اپنے مقاصد کی خواہش نے انھیں سکھا دیا تھا کہ جذبات کو عقل کے تابع رکھنا چاہئے۔ انھیں قوم کے نوجوان راہنماؤں کا بے نتیجہ جوش و خروش سخت ناپسند تھا اور انھوں نے کئی نجی خطوط میں نئی صورتِ حالات پر رنج و افسوس کا اظہار کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

سخت افسوس ہے کہ ہر حیثیت سے زمانہ میں خربازاری بڑھ گئی ہے۔ نیک و بد کی تریز مطلق نہیں۔ ابھی آغا خاں۔ علی محمد خاں۔ محمد علی کو آسمان پر چڑھایا۔ ابھی اوپر سے زمین پر دے مارا۔ اپنی گرہ کی عقل نہیں مسلم کوٹ کی ہر خیر کو ایک لونڈا پڑھ کر سمجھ سکتا ہے کہ معاندانہ اور یک طرفہ ہے لیکن سینکڑوں حق اس کی حریت کے قائل ہیں۔

اس زمانے میں مسلم لیگ کے سکریٹری مسٹر (حال سر) وزیر حسن اور لیگ کی شاخ لندن کے صدر سید امیر علی کے درمیان مسجد کا بیورا بلکہ لیگ کے عام انتظامی معاملات کے متعلق اختلاف پیدا ہو گیا۔ مولانا محمد علی مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے تمام فوجوان احرار نے وزیر حسن صاحب کا ساتھ دیا۔ صرف شبلی ہی طبقہ احرار کے ایک فرد تھے جنہیں قوم کے ایک دیرینہ اور پختہ کار خادم، سید امیر علی کے ساتھ فوجوالوں کی یہ کم بھی گراں گزری ایک خط میں لکھتے ہیں:-

پولٹیکل معاملات میں جو طوائف الملوک پیدا ہو گئی ہے سخت قابلِ نفرت ہے۔ وزیر حسن اور امیر علی کا کیا مقابلہ ہے؟ قوم حقیقت میں سرسید مرحوم کے وقت بھی اندھی تھی۔ اور اب بھی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال ایک لحاظ سے شبلی کے خیالات کا آئینہ اور ان کی دلی خواہشات کی تکمیل کا موثر ذریعہ تھا۔ لیکن بالآخر الہلال نے جو رنگ اختیار کیا اور مخالفوں کی تضحیک کے لئے جو طریقے استعمال کئے۔ شبلی ان سے بالکل کنارہ کش تھے اور انہوں نے علانیہ ایک نظم میں جس کا عنوان تھا۔ مد و جزر۔ الہلال کا لب و لہجہ۔ اس پر نکتہ چینی کی اس نظم کے چند شعر ہیں۔

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟
 راہنماؤں کی یہ تحقیر، یہ اندازِ کلام اس میں کچھ شائبہ شک کے حسد ہے کہ نہیں؟
 شاعروں نے جوئی آج کھائی ہے بساط اس میں ان پر بھی کہیں کوئی زد ہے کہ نہیں؟
 پہلے گرشانِ غلامی تھی تو اب خیرہ سری! اس دورِ راہے میں کوئی بچ کی حد کہ نہیں؟

لیکن شبلی کو زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ قومی معاملات نے جو رنگ اختیار کیا۔ اس کی وجہ سے قوم کا شیرازہ منتشر ہو گیا شبلی میں ایک طرز کی اناہیت کی کمی نہ تھی۔ انھیں اپنی ذات سے محبت تھی۔ اپنے ندوہ سے محبت تھی۔ اپنے خیالات سے اُس تھا۔ لیکن اس مجموعہٴ اضداد کو سب سے زیادہ محبت سب سے زیادہ اُس، سب سے زیادہ لگاؤ اسلام اور اپنی قوم سے تھا اور جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے اپنے خیالات کی اشاعت و مقبولیت کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ قوم کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو انھوں نے نئی صورتِ حالات پر رنج و کرب کا اظہار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ پہلے شبلی نے شخصی خطوط میں قوم کی نئی لامرکزیت پر اُسو بہائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ”اس وقت مسلمان سخت پرانگندہ اور پریشناں خیال اور پریشاں عمل ہو رہے ہیں۔ کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے ورنہ ہر طرف سے ٹھٹھکے بھٹکے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے“ اور جب یہ نجی تحریریں کارگر نہ ہوئیں۔

تو انھوں نے اخبارات میں اشعار کے ذریعے اپنا دردِ دل بیان کیا۔ ان کی اخیر عمر کی ایک نظم ہے۔ ”خطاب یہ احرار۔ ایک مرکز کی ضرورت“ اس کے بعض اشعار ہیں۔

بتکدے اپنے ڈھائے، بہت اچھا، لیکن شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی تو رکھے بنیاد
 آبلہ قابلِ نشر تھا، یہ مانا، لیکن دیکھئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد

۲۲۸
 آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا خیر جو کچھ تھا مگر جمع تو تھے کچھ آزاد
 اب کوئی مرکز قومی ہے نہ توحید خیال! نہ کوئی جادہ مقصد ہے نہ کچھ توشہ زاد!
 خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازہ قوم!
 خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد!
 ڈرے جس طرح سے ہو جاتے ہیں اڑاڑ کے فنا
 یوں ہی ہو جائے گی پھر قوم بھی آخر برباد!
 انسانی تجویزوں اور مضبوطیوں کا عجیب حال ہے۔ ذہن انسانی کے اندر
 تو ان کا کچھ اور ہی رنگ ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ تخیل کے تجروں سے نکل کر
 عمل کی دنیا میں آتے ہیں۔ تو بعض اوقات ایسی عجیب عجیب شکلیں اختیار کر لیتے ہیں
 کہ خود انھیں سوچنے والا حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔
 شبلی نے کیا سوچا تھا اور ہو کیا گیا!!

وفات

ندوة العلماء کی بساط پر شبلی نے بڑی طرح مات کھائی تھی اور قومی قیادت کی مجلس میں بھی انھیں بالآخر رنج و مایوسی کا تلخ جام پینا پڑا۔ اس وقت ان کی صحت کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایک ”محرک لاش“ کہتے تھے۔ اور کوئی ہوتا تو ہمت ہار دیتا۔ اور قومی کاموں سے دست بردار ہو جاتا۔ لیکن مولانا میں بلا کا استقلال اور حوصلہ تھا۔ انھوں نے اپنی تمام عمر کے ارمانوں کو خاک میں دفن ہوتے دیکھا۔ انھیں رنج تو بے حد و بیرون از قیاس ہوا ہو گا۔ لیکن انھوں نے دل پر تیغ رکھا اور دہلی کے جلسہ سے بے نیل مرام رخصت ہونے کے فوراً بعد سید سلیمان ندوی کو لکھا۔

ندوہ تو سرِ دست گیا۔ اب کیا کرنا چاہئے؟ آزاد سے مشورہ ہوا۔ رائے یہ ٹھہری کہ اصل غرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے۔ اس لئے میں خود دو چار قابل طلبا کو اپنے پاس رکھوں اور ان کو کسی کسی فن میں تیار کروں اور صحیح مذاق ان میں پیدا کر لیا جائے ان کے مصارف کا تکفل بھی (جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہو گا۔

مولانا نے اس زمانے میں دارالمصنفین جاری کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا اور اہللال میں اپنی تجویز ملک کے سامنے پیش کر دی تھی۔ اب انھیں ہر طرف سے بھٹک بھٹک کر نظر آ گیا تھا کہ وہ سب سے پہلے ایک مصنف ہیں۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ انتہائی علم و فضل اور مذہب سے کمال محبت کے

باوجود ان کی شخصیت میں حسن سیرت کے ایک دو خانے اس طرح خالی تھے کہ ان کے لئے علما کی محفل میں میر مجلس ہونا ناممکن تھا۔ قومی قیادت کے میدان میں بھی اب معاملہ خوشنما تھا و بڑا اور محض لبرل خیالات سے بہت آگے نکل چکا تھا اور اس میدان میں وہ نوجوانوں کا ساتھ دے سکتے تھے۔ لیکن اس وقت بھی ایک مملکت ایسی تھی جس میں ان کا سکھ چٹا تھا اور ایک محفل اس طرح کی تھی جس کی صدارت کے لئے ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ یہ مملکت علم و ادب کی مملکت اور یہ محفل ادبا و اہل علم کی محفل تھی۔ اب شبلی کو ان چیزوں کی قدر و منزلت معلوم ہوئی اور انھوں نے اندازہ لگایا کہ اگرچہ بڑے ادارے چلانے ان کے بس میں نہیں لیکن اپنے قلم کی مدد سے ہی وہ ایسا اثر حاصل کر سکتے ہیں۔ جو بڑے بڑے مدرسوں اور عالی شان اداروں کو بھی میسر نہیں۔ وہ نومبر ۱۹۱۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

ہندوستان میں اور ہر کام کے لئے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے۔ اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے۔ ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔

جلسہ دہلی کے بعد مولانا مبینی میں سیرت النبی کی تالیف میں مصروف تھے اور ساتھ ساتھ احباب سے یہ مشورہ کر رہے تھے کہ دارالمصنفین کو کس جگہ قائم کیا جائے علی گڑھ میں؟ لکھنؤ میں؟ یا اعظم گڑھ میں؟ کہ اس سوال کا حل خود تقاضا قدر نے کر دیا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں ان کے بھائی مولوی محمد اسحاق نے وفات پائی۔ اور اب وہ مجبور ہو گئے کہ سب طرح سے آنکھیں بند کر کے اعظم گڑھ کا رخ کریں۔ اس بھائی کی وفات نے ان پر بڑا اثر کیا۔ ایک تو وہ خود ان دنوں غموں، مایوسیوں اور جسمانی کمزوری سے

نڈھال تھے۔ دوسرے اسحق مرحوم نے انھیں سب خاندانی ذمہ داریوں سے آزاد کر رکھا تھا۔ بھائی کی وفات نے مولانا کی کمزور دی اور انھوں نے ”بربادی خانماں شبلی“ کے عنوان سے اس کا ایک دل ہلا دینے والا مثنوی لکھا۔ وہ برادر کہ مرا یوسف کنگانی تھا وہ کہ مجموعہ ہر خوبی انسانی تھا وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمت یزدانی تھا قوت دست دل شبلی نعمانی تھا جوش اسی کا تھا جو سیر سر پر شوریں تھا

بل اسی کا یہ مرے خامہ پُر زور میں تھا
جب کیا والد مرحوم نے دُنیا سے سفر گھر کا گھر تھا ہدفِ ناوک صد گو نہ خطر
بن گیا آپ اکیلا وہ ہر آفت میں سپر تیر جو آئے۔ گیا آپ وہ ان کی زد پر
خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں

اس غم اسلئے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں
اس کا صدقہ تھا کہ ہر طرح سے تھا میں غم گھر کے جھگڑوں نے کچھ فکر نہ کچھ رنجِ دالم
امنِ راحت کے جو سامان تھے ہر طرح بہم میں تھا اور مشغلہ نامہ و قرطاس و قلم
اسکے صدف سے تھی میری سخن آرائی بھی

اس کا ممنوں تھا رگوں شہنائی بھی !

بھائی کی وفات نے مولانا کا دل بٹھا دیا۔ لیکن یہ ہمت اور استقلال کا پہاڑ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہ مولانا شرفانی کو یہ لکھ کر کہ ”عزیز مرحوم کے واسطے نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر نہیں ہوا تھا“ انھیں اپنے نصیب اور اوروں کی اطلاع دیتے ہیں۔ ایک کام تو محمد بن شبلی سکول کا چلانا تھا جسے انھوں نے اعظم گڑھ میں ۱۸۸۲ء میں قائم کیا تھا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں :-

مجھ کو اس کام کے علاوہ دارالمعینین اور دارالکلیل کی فکر ہے۔ غدہ میں کام کرنا

ممکن نہ تھا۔ ۴ برس تک کشاکش میں گزرے۔ جو ہو گیا وہ تعجب انگیز ہے بہر حال صورت موجود یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے۔ جس کا کل رقبہ گیارہ سیکھ پختہ ہے۔ اس کو وقف کر رہا ہوں اور شرکاء بھی راضی ہو گئے ہیں۔ مسودہ لکھا جا چکا۔ رجسٹری کرانا ہے۔ دو بجے پہلے سے موجود ہیں۔ کتب خانہ (دوبارہ) بقدر مقصد بہتیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا۔ بلکہ صرف کتب خانہ کے لئے کافی ہوگا۔ دارالمصنفین کی عمارت کے لئے کچھ اضافہ ہوگا۔

شبلی کو بھائی کی وفات کا دلی صدمہ تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اعظم گڑھ پہنچ کر اور کام شروع کر کے انھیں ایک طرح کا سکون آ گیا۔ ان کے آخری دو سال، بلکہ قیام ندوہ کے آخری پانچ سال بڑی کشمکش اور کرب و بے چینی میں گزرے تھے۔ ان ہنگاموں سے نکل کر وہ اعظم گڑھ کی عزت گاہ میں آئے تو طبیعت کو بالکل ایک نیا قرار محسوس ہوا بلکہ ان کی زخم خوردہ انسانیت کی تسکین کے لئے ایسی سہولتیں پیش آئیں کہ دل میں فرحت و مسرت کے جذبات اُبھنے لگے۔ مولوی سعود علی ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے۔ ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے۔ تعلیمی کام شروع ہو گئے ہیں۔ کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ بالکل ایک شاہ مت معلوم ہوتی ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پانچویں میں بسر کئے۔

باغ ہے۔ بنگلہ ہے۔ حکومت ہے۔ گریجویٹ ہیں۔ اسکول ہے۔ تعلیمی اہمیت ہے اور سب حسبِ دلخواہ کام کرتے ہیں نہ کہ وہاں سگانِ بازاری کے ساتھ عوام میں مبتلا ہونا۔

شبلی کو تمام عمر اعظم گڑھ ناپسند رہا۔ علی گڑھ سے ایک سال کی رخصت لے کر یہاں آئے۔ تو قطعی دل نہ لگا اور اس زمانے کے کئی خطوں میں کہتے ہیں کہ اعظم گڑھ میں ہرگز بس نہیں کر سکتا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں ”اعظم گڑھ میری قسمت میں نہیں ہے۔ اور اب مجھ کو وہ لگاؤ بھی نہیں رہا۔ انھیں اپنے دنیا دار والد سے بھی کئی شکائیں تھیں۔ لیکن خدا کی شان ہے کہ مخالفت کے اس طوفان میں، جو اخیر عمر میں شبلی کے خلاف برپا ہوا۔ ان کی آخری جائے پناہ ان کے باپ کا باغ اور بنگلہ تھا۔ اور وہ اعظم گڑھ جسے شبلی تمام عمر اپنی تجویزوں کے لحاظ سے نہایت حقیر سمجھتے رہے۔ ان تجویزوں کی تکمیل کا سب سے موزوں گہوارہ ثابت ہوا!

اعظم گڑھ پہنچ کر شبلی کی طبیعت میں تسکین آگئی۔ لیکن اب ان کے خطوں سے ایک قسم کی تکان اور پشیمردگی پکیتی ہے۔ فیضی زہرا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-
مکرمہ من! آہ کیا لکھوں۔ میں اب کسی کام کا نہیں رہا۔ برادر مرحوم کی وجہ سے میں آزاں پھرتا تھا اور جہاں چاہے رہتا تھا۔ اب وطن سے نکلنا محال سا ہو گیا ہے۔ مرحوم گھر بھر کا چراغ تھا اور سب کا روبرو اس کی بڑلت چلتا تھا۔ اس حالت میں بھی عطیہ کی یاد دل گہرائیوں میں اسی طرح جلوہ نکل تھی۔ جس طرح اندھیری رات میں ایک جگنو ٹمٹماتا ہے۔ اسی خط میں آگے چل کر،
حجیم دوست کے پاس ان سے کہتے ہیں:-

عطیہ اگر آجائیں تو بہت سلام شوق کہئے۔ اور کہئے۔ کہ کاش وہ میرے گھر آکر تعزیت کرتیں کہ دل کو تسکین ہو سکتی۔“

تصنیف
اس کے علاوہ ان پر مخالفوں کے تیرا بھی چل رہے تھے۔ ملک کو اپنی نئی
سے روشناس کرنے اور سیرت النبی کا انداز تحریر دکھانے کی خاطر انھوں نے اہلال

میں سیرت النبی کا مقدمہ شائع کیا تھا۔ مولوی عبدالشکور صاحب ایڈیٹر الخیم نے اپنے نقطہ نظر سے اس مقدمہ پر نہایت سخت تنقید لکھی۔ مخالفین نے جن میں دیوبند کے کچھ لوگ بھی شامل تھے۔ اس تنقید کو دستاویز بنالیا۔ اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا۔

مولانا کی صحت بھی اب بالکل جواب دے رہی تھی اور انھیں نظر اڑا تھا۔ کہ یہ کام ان سے ختم نہ ہوگا۔ سیرت کی نامی ان کے دل پر ایک سخت رنج و داغ تھا۔ مولوی حمید الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

سیرت پوری نہ ہو سکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے۔

افسوس کہ یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ شبلی سے سیرت پوری نہ ہوئی اور اگرچہ ان کی وفات کے بعد سید سلیمان ندوی اور ان کے رفقاء نے کارے کتاب کو مکمل کر دیا۔ لیکن جس انداز اور معیار پر شبلی نے کتاب لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ نظر انداز ہو گیا۔

اخیر عمر میں شبلی کو سیرت سے بے حد شغف ہو گیا تھا۔ اب سیرت ان کے لئے ایک ڈھال بھی تھی اور ایک شمشیر خارا شکاف بھی۔ جب مخالفت ان پر طرح طرح کے الزام لگاتے تو وہ حضور رسالت مآب کی بارگاہ میں پہنچ کر اور سیرت میں مشغول ہو کر دشمنوں کے حملوں اور مناقشات سے پناہ لیتے۔ سیرت ان کی اس کمینہ کی کامیابیوں کا ذریعہ بھی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مولوی محمد امین زبیری کی مدد سے بھوپال کے ناہوار دو سو روپے سیرت سے دارالمصنفین کو منتقل کرائے اور اپنی بھیندوں کے نئے مرکز کو شروع سے ہی وہ مالی امداد ہم پہنچا دی۔ جو ندوہ کو دس بارہ سال کی مدت حیات کے بعد بھی حاصل نہ ہوئی تھی۔

سیرت کی نامی ان کے داغ کے علاوہ شبلی کو اپنی عمر کے آخری ایک دو مہینوں

میں ایک اور چرکا لگا۔ یورپ کی پہلی جنگ عظیم اگست ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی اور نومبر میں ترکی بھی برطانیہ کے خلاف میدان میں آگیا۔ اس وقت ترکی کے اس سچے شیدائی کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہوگی۔ اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ لیکن بے بس تھے۔ شبلی کے جذبات شعر بن کر اُبلتے ہوئے تھے۔ لیکن اہو کے گھونٹ پی کر خاموش ہونا پڑتا تھا۔ وہ ان دنوں بیمار بلکہ بستر پر دراز تھے کہ انھیں ایک خاص طور پر رنجیدہ صورت حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

نومبر ۱۹۱۴ء میں ترکوں نے بھی لڑائی میں جرمنوں کے ساتھ ہو کر انگریزوں اور اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ ہر شہر کے پُرانے وفادار مسلمانوں کی طرح اعظم گڑھ کے چند وفاداروں نے بھی ترکوں سے برائت کا اعلان مناسب سمجھا اور اس کے لئے قیامت یہ کہ خود شبلی منزل کو جلسہ کا مقام بنایا۔ جس کی مولانا کو خبر نہ تھی۔ عین وقت پر جب وہ دوسرے کمرے میں موت کے بستر پر پڑے تھے۔ ان کے بچپن کے ایک بے تکلف دوست ان کے پاس گئے۔ ”وکر آپ رضا مندی دے تو جلسہ آپ کی صدارت میں ہو“ مولانا یہ سن کر بے چین ہو گئے۔ ان کی طرف منہ کر کے فرمایا۔ ”بھائی صاحب میں تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ترکی اپنی جوتیوں میں میری کھال کا شمشیر بھی لگائیں“

مولانا نے جلسے کی صدارت نہیں کی لیکن اخبارات میں اعلان ہوا۔ حکام کو اطلاع دی گئی کہ اعظم گڑھ کے مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ برطانوی حکومت سے وفاداری اور ترکوں سے علیحدگی کا اظہار کرنے کے لئے شبلی منزل میں منعقد ہوا۔

علامہ شبلی شہیدِ علالت کی وجہ سے جلسے کی صدارت نہیں کر سکے۔ لیکن شہر کے دوسرے معززین جمع تھے۔ اور اتفاق رائے سے ترکوں سے علیحدگی کا رزمیہ منظور ہوا!!

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے۔ ترکوں سے اختلاف کے اظہار کے لئے ترکوں کے سب سے بڑے محب کا گھر منتخب کیا جاتا ہے۔ مولانا اس وقت مکان پر موجود ہیں۔ جس کمرے میں جلسہ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اتنی سکت نہیں کہ جلسے کو روک سکیں!!

شبلی کی صحت دوچار سال سے بہت خراب رہنے لگی تھی۔ ان کا قلب ایک عرصے سے کمزور تھا اور معدے کی حالت اس سے بدتر تھی۔ انیر عمر میں اسہال کے دورے جلد جلد پڑنے لگے اور ضعف بہت بڑھ گیا۔ نومبر ۱۹۱۳ء میں انھوں نے انیون کھانی شروع کر دی تھی۔ لیکن اس سے فقط عارضی افاقہ ہوا۔ اس کے قریباً ایک سال بعد، نومبر ۱۹۱۴ء کو وہ عارضی کی تقریب میں بندول تشریف لے گئے۔ دوسرے دن پلٹ کر واپس آئے۔ تو اپنے قدیمی مرض اسہال اور سہجین میں مبتلا تھے۔ تین روز تک انگریزی ڈاکٹر کا علاج رہا۔ لیکن اس سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ چوتھے روز یونانی طبیب کو بلایا گیا۔ اس کی دوا سے حالت اور بگڑ گئی۔ ایک دن میں ۵۰-۶۰ سٹ آئے اور خون بھی بہت آیا۔ اس سے ضعف کی شدت بڑھ گئی۔

مولانا کو اس حالت میں بھی سیرت کا خیال سب سے پہلے تھا۔ جب ان کی علالت کا ابھی آغاز تھا۔ تو انھوں نے سیرۃ بنوئی کے تمام مسودے بیٹھے بستے میں بندھوا کر الماری میں مقفل کر وادئے تھے۔ جب حالت نازک ہو گئی۔ تو انھوں نے اپنے تین مخصوص تلامذہ اور زقائے کار مولانا

ابوالکلام آزاد۔ مولوی حمید الدین۔ سید سلیمان کو فرداً فرداً تار بچوائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے تار کا مضمون تھا۔

اگر آپ اس اثنائیں مل جاتے تو سیرت نبویؐ کی سیم کا کچھ انتظام ہو جاتا۔
ورنہ سب کیا کرایا بیکار ہو جائے گا۔ سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو اُن کو
چودا پلین سمجھا دیا جاتا۔

بپتہ نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ تار ملایا نہیں۔ کیونکہ ان کی طرف
سے کوئی جواب نہیں آیا۔ لیکن سید سلیمان، کسی تار کے ملے بغیر فقط دل کی
کشش سے اعظم گڑھ روانہ ہو گئے اور ۱۵ فروری کی شام کو وہاں جا پہنچے۔
جس وقت شاگرد استاد کے پٹنگ کے قریب گیا تو طاقت جواب دے چکی تھی۔
شاگرد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، علامہ نے آنکھیں کھول کر حسرت سے سلیمان
کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا؟ پھر زبان
سے یہی فرمایا۔ ”اب کیا“ ”اب کیا“ لوگوں نے پانی میں جواہر مرہ گھول کر
ایک چیم پلایا۔ توجہ میں یک بار طاقت محسوس ہوئی اس وقت علامہ نے
معاہدہ کے طور پر سلیمان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ ”سیرت میری
تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کے سیرت تیار کر دو“ سلیمان نے
بقرائی ہوئی آواز میں وعدہ کیا۔ ”ضرور۔ ضرور“

اگلے روز شام کو مولانا حمید الدین بھی آ گئے۔ پھر انھیں اور سلیمان کو
بلا کر کہا۔ ”سیرت سیرت“ اور آنکھوں سے لکھنے کا اشارہ کر کے کہا۔ ”سب
کام چھوڑ کے“

مولانا کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ طبی علاج و اہتمام جاری تھا۔ لیکن اب مولانا نے دوا کے استعمال سے انکار کر دیا اور آخری تین روز کوئی دوا نہیں پی۔ سترہ کی شام کو ڈاکٹر محمد نعیم جو انصاری وفد میں شریک تھے۔ آئے تو انہوں نے تمام اعضا کا معائنہ کر کے کہا۔ ”دماغ کے سوا باقی تمام اعضا معطل ہو چکے ہیں۔ اب تدبیر بے سود ہے۔“ اس کے کوئی بارہ گھنٹے بعد شبلی نے آخری سانس لیا اور ۸ نومبر ۱۹۱۲ء کو چہار شنبہ کے دن صبح کے ساڑھے آٹھ بجے دنیا کو الوداع کہا۔

شبلی کی وفات پر علمی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ دوستوں۔ شاگردوں۔ اور عقیدتمندوں نے مرثیے اور نازخیں لکھیں۔ عزیز لکھنوی کا قطعہ تاریخ تھا۔

آہ سرد فترِ اربابِ کمال	کہ رد فتر کدہ فانی رفت
حاکم محکمہ علم و حکم	ناظم ملک سخن دانی رفت
فاضل و افضل و بے مثل نمائند	کامل و اگمل و لاثانی رفت
با کمالے کہ تو آگاہی از تو	ہمہ دائے کہ تو مے دانی رفت
بردل و جان من ز رفتن او	درج روحانی و جسمانی رفت

خاست چوں از سر جاں ہاتھ گفت

مولوی شبلی نعمانی رفت

۱۳۳۵ھ

سید سلیمان نے لوحِ مزار کے لئے تاریخ لکھی جو شاعرانہ اور ادبی نقطہ نظر سے بیش قیمت نہ رہی۔ لیکن لکھنے والے کے حسنِ عقیدت کا پتہ دیتی ہے۔ سعدی عمر و غزالِ زمانِ خلدنِ وقت شبلی نعمانی والا گہرِ عالی سرشت

سیرہ صد بودی و دود روز پنجیں بست و ہشت بہ ذی حج کلین منزل بہشت
شبلی کی وفات پر عطیہ گیم صاحبہ کی خاندانی ڈائری میں جو اندراج ہوا
شاید وہ بھی کسی قدر دلچسپی سے پڑھا جائے۔ یہ اندراج جو وفات کے
کوئی دو مہینے بعد لکھا گیا۔ حسب ذیل تھا۔

وفات مولانا شبلی نعمانی نومبر ۱۹۱۷ء

وفات مولانا الطوفان حسین صاحب جالی دسمبر ۱۹۱۷ء

یہ کیسے مشاہیر منہ چلے گئے اور مولانا (شبلی) صاحب تو کیسے ہمارے
دوست تھے اور ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ

یادگار زمانہ ہیں ہم سن رکھو فناء ہیں ہم
مولانا شبلی اولاد کے معاملے میں خوش قسمت نہ تھے۔ ان کے بہت سے
بچے صغیر سی میں وفات پا گئے۔ دو بیٹیاں جو جوان ہوئیں۔ وہ بھی صاحب
اولاد ہو کر ان کی زندگی میں ہی چل بسیں۔ مولانا کی وفات کے وقت فقط
حامد حسن نعمانی زندہ تھے۔ لیکن مولانا کی اصل اولاد سلیمان۔ مسعود علی ندوی
اور عبدالباری تھے۔ جو ان کے علمی وارث بنے اور جن سے زیادہ سعادتمند
اولاد کسی خوش نصیب باپ کے حصے میں نہ آئی ہوگی۔

مولانا کے آخری سال بڑی مایوسیوں اور ناکامیوں کے تھے لیکن یہ
مایوسیاں عارضی اور یہ ناکامیاں ظاہری تھیں۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے
انھیں اس امر کا اندازہ ہو گیا تھا کہ خواہ وہ علما کے ”شیخ الکمل“ یا
پولٹیکل مجلس کے صدر نشین ہونے کے اہل نہ ہوں لیکن وہ ایک کامیاب
شاعر اور کامل الفن ادیب تھے۔ اور ”ایک کامیاب مصنف لاکھوں لوگوں
پر حکمرانی کرتا ہے“ انھوں نے اس زمانے میں ایک تصنیفی انجمن کا کام

شروع کیا اور ان کی وفات کے چند ماہ بعد دارالمصنفین کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ جس نے شبلی کے خیالات کی اشاعت اور ان کے ارادوں کی تکمیل میں مدد سے بھی بڑھ کر کام کیا ہے۔ ندوے کی بساط پر شبلی نے بازی ہاری تھی لیکن آج شبلی کے ندوی حریفوں کو کون جانتا ہے؟ مسلم گزٹ کے جن پرچوں میں ان کے خلاف اعتراضات اور الزامات چھپے تھے انھیں سخت تلاش کے بعد بھی حاصل کرنا دشوار رہے لیکن شبلی کے قلم کی ایک سطر موجود ہے اور اردو ادب کا جزو بنتی جاتی ہے۔

شبلی کے خیالات آج بھی فضا میں گونج رہے ہیں اور قوم کے دل و دماغ پر ان کا سکہ برابر جاری ہے :

ضمیمہ

مولانا شبلی اور خاندان فیضی

”مولانا شبلی کی جب ہم سے پہلی ملاقات ہوئی ہے تو ہمارے درمیان کوئی حقیقت نہ تھی۔ وہ ۱۸۹۲ء میں جب استنبول گئے تھے تو میرے والد مرحوم حسن آفندی صاحب نے جو بارگاہ سلطانی میں کافی رسوم اور ارکان سلطنت پر بہت کچھ اثر رکھتے ان کی بہت خاطر تواضع کی تھی اور علی گڑھ کالج کے پروفیسر کی حیثیت سے خاص حلقوں میں ان کا تعارف بھی کرایا گیا۔

ایک مدت بعد والد مرحوم کا انتقال ہو گیا اور ہمارے خاندان کا مستقل قیام بمبئی میں ہوا۔ ایک مرتبہ ہم بہنوں کو لکھنؤ جانے کا موقع ملا۔ یہاں شیخ مشیر حسین قدوائی ہار ایٹ لاؤ تعلقہ دار گدیہ کے دولت خانہ پر مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی جن کی علمی شہرت ہم سُن چکے تھے ہم بہنیں ان کی باتوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئیں۔ اس وقت وہ ایک پرانے خیال کے مولوی معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد مولانا بمبئی آئے ہم سب نے بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح ان کا استقبال کیا اور جب واپس ہوئے تو سلسلہ خط و کتابت جاری ہو گیا۔

دوسرے سال ان کے پاؤں میں گولی لگنے کے بعد وہ مصنوعی پاؤں کے انتظام کے لئے بمبئی آئے اور پھر دوبارہ آئے۔ ہم سب سے بڑے مکلفانہ ملاقاتیں رہیں۔ کبھی کبھی ان ملاقاتوں میں ہمارے خاندان کی اور بیگمات بھی شریک ہوتی

تھیں۔ علمی۔ قومی۔ سیاسی باتیں ہوتی تھیں اور سب ہی عورتیں اور مرد ان کی عزت کرتے تھے۔ جنجیرہ میں بھی ان کو مدعو کیا گیا اور ان کے نندہ کو بھی اخلاقی و مالی مدد دی گئی۔

ان ملاقاتوں میں اب وہ پہلے سے مولانا نہ تھے۔ نہایت آزاد خیال عورتوں کی سوسائٹی میں بے تکلف شرکت کرتے تھے۔ رسمی و رواجی پردے کے علمی و عملی طور پر مخالف تھے۔ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے شعر و شاعری اور مہذب لطائف و ظرائف اور خیالات کی یکسانی سے یہ ملاقاتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔

غرض ان کی زندگی بھر یہ سلسلہ قائم رہا ان کے انتقال کا ہم سب کو عزیزوں کی طرح رنج ہوا ہم نے ان کے خطوط کو جو اس وقت موجود تھے بڑی حفاظت سے رکھا۔ کیونکہ ان خطوں میں بھی ایسی ہی باتیں تھیں۔

۱۹۲۲-۲۳ء میں اڈیٹل سلطان محمد امین صاحب زبیری جن سے بھوپال کے توپل سے ہماری ملاقات تھی اور جو مولانا کے بھی بڑے مداح اور دوست تھے بمبئی آئے اور ان سے مولانا کا تذکرہ آیا تو میں نے ان کو وہ خطوط دکھائے اور ان کی درخواست پر نطل السلطان میں اشاعت کی اجازت بھی دے دی اور پھر یہ مجبوراً شائع ہوا۔ اس واقعہ کو سالہا سال ہو گئے مگر اب تھوڑا عرصہ ہوا جب میرے علم میں آیا کہ اسی زمانہ میں مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے خطوں کا ایک مجموعہ مکتب شبلی کے نام سے شائع کیا تھا اور اس میں بعض خطوط ایسے بھی شائع کئے جن سے ہمارے نام کے خطوط کے ساتھ رابطہ اور سلسلہ ہے اور میری ذات و شخصیت کے متعلق اشارے ہیں۔ ان خطوں کے

دیہوں اور افسانہ نگاروں کو بھی ایک بڑا مواد اور مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے۔
 بیڈیو پر تقریر ہوئی اور اڈر ورسائل میں مضامین شائع کئے گئے۔ اگرچہ ہمارے
 خطوں میں تو کوئی بات ایسی نہ تھی۔ البتہ مکاتیب شبلی کے خطوں کے ساتھ پڑھنے
 سے بے شک یہ مواد ملتا ہے مولانا ایک شریف گھوڑ میں ایک عالم، ایک
 بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں۔ جہاں
 بڑی عزت سے ان کا استقبال ہوتا ہے۔ لیکن ان کے دل میں درہی جذبات
 پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کو ایسے رازدار دوستوں کے خطوں میں بھی ظاہر
 کرتے رہتے ہیں۔ جو مہذب تعلیم یافتہ اور عالم بھی ہیں اور یہ بزرگ ان
 خطوں کو اشاعت کے لئے نذر کر دیتے ہیں اور ان کے جانشین بھی جو
 علم و اخلاق اور ادب کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے ہیں ان کو شائع
 کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس طرح وہ لائبل کے جرم کا ارتکاب
 کر رہے ہیں۔ کیا اسی معیار شرافت پر ان عالموں اور افاضلوں کو ناز
 ہے؟ ان کو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہئے تھا کہ اگر ان کے خاندان
 کی خواتین اس پوزیشن میں ہوتیں تو وہ ایسے خطوط کی اشاعت کو ارا
 کرتے؟ اُنھوں نے یہ بھی غور کیا ہونا کہ خود مولانا شبلی کے اخلاق کے
 متعلق دنیا کیا رائے قائم کرے گی۔

ہم نے مولانا کے خطوں کو جو ہمارے نام آتے تھے۔ ہمیشہ معصومانہ روشنی
 میں دیکھا۔ کیونکہ ان میں بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی
 کسی قسم کی بدگمانی کرنایا کسی بُرائی کا احساس ہوتا۔ البتہ بعض میں شوخی
 ضرور ہوتی تھی۔ جو شاعرانہ طبیعت کا خاصہ ہے۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے
 کہ یہ رازدار اشارات اُن ہی جذبات پر مبنی تھے اور بعض نظموں میں بھی

ان کو بھی شاعری کے پردے پر ظاہر کرتے تھے۔
 میں محمد امین صاحب زبیری کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہماری پوزیشن
 کو تبصرہ حیاتِ شبلی میں بیان کر کے صاف کر دیا اور دنیا کو اصل حقیقت
 بتادی۔ واقعی سعدی کا یہ قطعہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے کہ:-
 ”انسان کے علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہو جاتا ہے۔ لیکن نفس کی
 خباثت برسوں میں بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اور ہم بھی اسی علم و لاعلمی میں
 رہے۔“

عطیہ بیگم

(ادبی دنیا۔ ماہ جولائی۔ اگست ۱۹۴۶ء)

